جولائی 2004

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

حکومت اردو کے سلسلے میں آئین کی دفعات 345 اور 347 کے نفاذ اور اس زبان کو فروغ دینے کی کوشش کرے گی۔

مرکزی یونیورسٹیوں سے اقلیتی پیشہ ورانہ اداروں کی براہ راست وابستگی کے معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے گا۔

اقلیتی فرقوں میں جدید اور تکنیکی تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے بھی اقدامات کیے جائیں گے۔ ایک قومی کمیشن قائم کیا جائے گا جو مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے سماجی اور اقتصادی طور پر پس ماندہ طبقات کو تعلیم اور روزگار میں رزرویشن سمیت ان کی بہبود میں اضافے کے لیے سفارشات پیش کرے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
[illegible] وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

گذشتہ دنوں شعبۂ اردو، گورنمنٹ برینن کالج، تھلاسیری (کیرالا) کے اردو طلبا کی انجمن "Brennen Urdu Lovers" (بلبل) کا جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا۔
جس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ، ڈائرکٹر قومی اردو کونسل نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ تصویر میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ ایک طالبہ کو اس کی اعلیٰ ادبی پیشکش پر شیلڈ عطا کرتے ہوئے۔

قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جارہے صفائی کمپیوٹر ایڈڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر، عثمان باغ، بہادرپورہ، حیدرآباد کا جلسہ تقسیم اسناد گذشتہ دنوں منعقد ہوا۔
اس موقعے پر جناب عبدالقیوم خان ایڈیشنل کمشنر آف پولیس ایک طالب علم کو سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے۔ ساتھ میں جناب خان لطیف خان چیف ایڈیٹر "منصف" حیدرآباد،
سید یوسف کونسلر، جناب خلیل احمد ندوی چیئرمین صفائی ایجوکیشنل سوسائٹی اور جناب توفیق احمد صدیقی۔

ماہنامہ

اردو دُنیا نئی دہلی

جلد۔6، شمارہ۔7 جولائی 2004

مدیر: ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
غیر ممالک کے لیے
10 امریکی ڈالر، سالانہ (بحری ڈاک سے)
15 امریکی ڈالر، سالانہ (ہوائی ڈاک سے)

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24615139

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2

ہماری بات .... اداریہ 5

● اردو کی تہذیبی معنویت .... سید علی محمد خسرو 6

● آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت — دتی میں .... مخمور سعیدی 17

● روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں .... علی احمد فاطمی 22

● ڈھائی ہزار زبانوں کے وجود کو خطرہ .... مظفر حسین 25

● مریخ پر زندگی .... عبیدالرحمٰن 27

● عہد حاضر اور فلسفۂ صحت .... حکیم اشہر قدیر 33

گوشۂ ادب:

● احمد فراز سے گفتگو .... رخشندہ جلیل 34

● گزارش بہ زبانِ اردو .... حمیدہ چوپڑا 36

● امیر آغا — ایک تاثر .... ملک زادہ جاوید 37

● اللہ حافظ بنام خدا حافظ .... احمد بشیر 39

گوشۂ فروغ کتب

● ہندستانی مسلمان کون ہیں؟ ("ہندستانی مسلمان" سے اقتباس) .... محمد مجیب 41

● لوک گیت ("اتر پردیش کے لوک گیت" سے اقتباس) .... اظہر علی فاروقی 51

طلبہ کے لیے

● انگریزی اور غیر ملکی زبانوں میں کیریئر (کیریئر گائیڈنس) .... سلمان عابد 55

● فرنٹ پیج .... شفقت علی 57

● تعلیم (کوئز) .... ایم نسیم اعظمی 59

● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-12) .... محمد سہیم الدین 63

اُردو خبرنامہ .... ادارہ 64

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 73

● ہندستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری/گوپی چند نارنگ .... مبصر: مخمور سعیدی

● ہندستان کا شاندار ماضی/اے. ایل. باشم .... مبصر: محمد سہیم الدین

● ذرائع نقل و حمل کی ابتدا/ایل. اے. ہیلسن .... مبصر: ریاض الدین

● انہار/رفیق راز .... مبصر: شمس الرحمٰن فاروقی

● اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ/محمد اشرف .... مبصر: تابش مہدی

بچوں کا گوشہ

● چمکنے والا جگنو ("حیوانات کی دلچسپ دنیا" سے اقتباس) .... محمد خلیل 77

● صدر جمہوریہ کے خواب اور ہندستانی بچے .... محمد اسحاق 79

آپ کی بات

■ سید شاہد مہدی، 7 اولوف پالمے مارگ، تیسری منزل، وسنت وہار، دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی وائس چانسلر شپ کے دوران میں آپ کا جو پُرخلوص تعاون حاصل رہا، اس کا میں مشکور ہوں۔ تعلیمی معیار میں بہتری لانے، نئے شعبوں کا قیام، نئے کورسوں کا آغاز، اکیڈمک اور انتظامی عمل کا نظم وضبط بہتر بنانا اور یونیورسٹی کے انتظامی امور میں انفارمیشن اور کمیونیکیشن ٹیکنالوجی کا استعمال باعثِ اطمینان ہیں۔ کیمپس اب مزید سرسبز وشاداب اور تازہ نظر آنے لگا ہے۔ اکیڈمک ماحول بہتر ہوا ہے اور اساتذہ اور طلبہ انٹرنیٹ سہولیات سے بہرہ ور ہونے لگے ہیں۔ ان برسوں میں مختلف ثقافتی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ یہ سب کچھ میرے طلبہ، Colleagues اور آپ جیسے بہی خواہوں کے تعاون سے ہی ممکن ہو سکا۔ مجھے امید ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کے نئے وائس چانسلر کو آپ کا تعاون جاری رہے گا۔

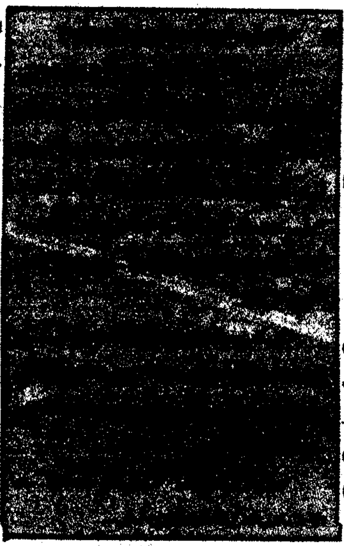

■ پران کیلا، پوسٹ باکس-5235، چانکیہ پوری، پی.او. نئی دہلی

اردو دنیا کے ماہ مئی 2004 کے شمارے میں راجندر یادو کا مضمون "لہو پکارے گا آستیں کا" بہت دلچسپ ہے۔ انھوں نے اردو زبان اور خاص طور پر اردو رسم خط اور دوسرے مسائل پر جن سے اردو زبان آج کل دوچار ہے، اپنے خیالات اور رائے پیش کی ہے۔ تقریباً سب مسائل منظرِ عام پر آچکے ہیں اور زبان کو سب سے بڑا اسیٹ بیک اسے پاکستان کی قومی زبان قرار دینے سے پہنچا ہے۔ پاکستان مذہب کی بنا پر وجود میں آیا تھا۔ اردو کا رسم خط عربی اور فارسی سے لیا گیا ہے۔ گو محترمہ شیبا فہمی اس کو غلط کہتی ہیں۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اسے مذہب کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔ آپ لاکھ دلیلیں دیجیے مگر عام آدمی کا یہ رویہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کا ملک پاکستان ہے، اس کا کیا کیجیے گا۔ مجھے کبھی ایسی کوشش نظر نہیں آتی جس سے عوام کا یہ بھرم توڑا جائے۔ حقیقت کیا ہے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بحث سمجھتے ہیں، گوپی چند نارنگ سمجھتے ہیں اور بے شمار لوگ بھی ان پر وقتاً فوقتاً بحث ہوتی رہتی ہے۔ اس شمارے میں ایک اور مضمون محترمہ شیبا فہمی کا ہے "جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی.........."

محترمہ نے اپنے مضمون میں اردو زبان کی موجودہ حالت پر غور کرنے کے بجائے راجندر یادو کے اٹھائے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ (اُن کا یہ جوابی مضمون ہے۔) اُن کی اس کوشش میں جھلک ملتی ہے کہ انھوں نے سچ سوالوں کو بے معنی ثابت کرنے کی پُرزور سعی کی ہے۔ راجندر یادو نے اپنے مضمون میں کچھ پتے کی باتیں کہی ہیں جو قابلِ غور ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اردو صرف ہندستان اور پاکستان میں ہی بولی جاتی ہے۔ یہ کسی اور ملک کی مقامی زبان نہیں ہے۔ جو ہندستانی اور پاکستانی باہر کے ملکوں میں جاتے ہیں، وہ یہی زبان بولتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں میں اسے سیکھنے کا شوق محض اکیڈمک ہوتا ہے۔

محترمہ نے اردو کو خلیجی ممالک اور سعودی عرب میں "لنک لینگوئج" کا درجہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ عرب افراد اردو سیکھ رہے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ہندستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے جو لوگ ان ممالک میں کام کرنے جاتے ہیں، اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ عربوں سے عربی میں بات کریں، جو وہ بہت جلد روزمرّہ کی ضرورت کے لیے پک اَپ کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر مزدور ہیں۔ لنک لینگوئج وہاں بھی انگریزی ہے۔

اب رہا مذہب کا سوال— ہندستان میں اردو جانتے ہیں۔ مگر عوام کو کیسے سمجھایا جائے۔

راجندر یادو کے سوالوں کا جواب دینے میں محترمہ بھٹک گئی ہیں۔ اردو زبان کے مسئلے کی بجائے مسلمانوں کی بہبودی کا مسئلہ لے بیٹھی ہیں۔ وہ ہندو دانشوروں سے پوچھتی ہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے کیا کیا (اردو زبان کے لیے نہیں)۔ وہ اس بات سے بھی منکر ہیں کہ اردو کو مسلمانوں کی بہبودی سے جوڑا جاتا ہے۔ جب ملک کا پردھان منتری یہ کہے کہ دو لاکھ اردو ٹیچروں کو نوکریاں دی جائیں گی تو اس کا کیا مطلب ہے؟

اردو زبان کا اپنا مقام ہے۔ یہ زندہ رہے گی تو اپنے بل بوتے پر، کسی کے رحم و کرم پر نہیں۔ یہ زندہ رہے گی یا نہیں، اس پر بحث نہیں۔ آخر سنسکرت کا کیا حشر ہوا؟ مکمل زبان ہونے کے باوجود یہ ختم ہوگئی۔ صرف اکیڈمک انٹرسٹ ہے اب اس میں۔ یادو نے یہ تو صحیح کہا ہے کہ اردو کو سنسکرت جیسا حشر ہونے سے بچائیے۔ زبان کو بھی وقت اور حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔ انگریزی کو لیجیے، کتنے ملکوں میں یہ زبان بولی جاتی ہے۔ شاید انگریزوں کو بھی اس کا پتہ نہ ہو مگر لوگ کیوں اس کو اتنی جلدی اپنا لیتے ہیں۔

اردو زبان والوں پر دیوناگری اسکرپٹ کون تھوپ رہا ہے اور کیوں؟ محترمہ کا مائنڈ سیٹ جاننے کے لیے ان کا یہ فقرہ دیکھیے۔ ''اردو والوں سے اردو کو دیوناگری میں لکھنے کی بات کہنا بہرحال پروفیسرانہ بات تو ہے جس کی بنیاد میں کاہلی اور حرام خوری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔''

محترمہ یہ اُن لوگوں کا نظریہ ہے جو اردو نہ تو سیکھ سکتے ہیں اور نہ پڑھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اردو کی خوبصورتی کو خراجِ تحسین دیا جا رہا ہے۔ اردو یا کوئی اور زبان اگر رومن میں لکھی جائے تو وہ رومن نہیں ہو جاتی۔ زبان تو وہی رہتی ہے جسے پڑھنے والا شناخت کر لیتا ہے۔ کے بی کانڈا نے اردو کو رومن میں لکھنے کی کوشش کی ہے اور یہ کامیاب رہی ہے۔ یا پھر دیوناگری ہی ہو۔

یادو کے ایک اور سوال پر محترمہ کو بہت اعتراض ہے اور وہ اسے صحیح نہیں مانتیں۔ ''مسلمان اس احساس سے آزاد نہیں کہ ان کے آباؤ اجداد عرب اور ایران سے آئے تھے اور ہندستان کے حکمراں تھے۔'' اپنا ناطہ باہر سے جوڑنا مسلمانوں کا اپنا بھرم ہے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ ہم چنگیزی خاندان سے ہیں۔ کوئی فریدی سے اور کوئی آفندی سے شجرۂ نسب جوڑ لیتا ہے۔ کچھ بابر کی اولاد سے اور کچھ بہادر شاہ ظفر کے خاندان سے یا پھر عرب کے کسی قبیلے سے۔ کسی مسلم طاقتور حکمراں کا نام لیجیے۔ شجرہ اس سے ملا دیا جائے گا۔ کسی کو کیا پتہ، آپ کہاں سے آئے ہیں جب تک آپ بتلائیں نہیں۔ ایک دفعہ پہاڑ کھڑا ہو جائے تو گرانا مشکل ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو اپنا شجرۂ نسب ہندوؤں سے جوڑتے ہیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا؟

گرامر زبان کی جان ہوتی ہے اور اسے رنگ روپ دیتی ہے۔ مگر آج کل ہر زبان میں مسئلہ بات کہنے اور سمجھانے کا ہے۔ گرامر پڑھنے کا نہیں۔ ہندستان میں انگریزی کا بحوالہ گرامر کیا حشر ہو رہا ہے۔ کسی کو کہہ کے تو دیکھیے صاحب یہ جو فقرہ آپ نے کہا ہے، گرامٹیکلی غلط ہے۔ پھر دیکھیے وہ آپ کو کیسے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میں جب اردو پڑھتا تھا تو 'ک' اور 'ق' میں فرق اس طرح بتلایا جاتا تھا۔ یہ کتے والا 'ک'۔ عام آدمی جب اردو بولتا ہے تو ش ق کے چکر میں نہیں پڑتا۔ شاید لوگ اب زیادہ سلیس ہونا پسند کرتے ہیں۔ اب کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ زبان کی باریکیوں میں جائے۔ اسے زبان دانوں اور اسکالروں پر چھوڑ دیجیے۔

جب سنسکرت نے حالات سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی شدھتا پر ڈٹی رہی تو ہندی ابھر آئی۔ اس کا رسم خط سنسکرت ہی ہے (جسے بہ ضرورت تبدیل کر لیا ہے) مگر اس نے زیادہ تر الفاظ عام بول چال اور مقامی بھاشاؤں سے لیے ہیں۔ یہ موجودہ سیاسی ستم ظریفی ہے کہ اس میں مشکل سنسکرت الفاظ تھوپے جا رہے ہیں جن کا عام بول چال سے کوسوں کا فاصلہ ہے۔

اردو زبان اگر آج ہندستان میں زندہ ہے تو اپنی خوبصورتی، نفاست، شیرینی اور جذبات کی ترجمانی کی وجہ سے ہے۔ پڑھنے اور سننے والا اس کی ان خوبیوں کو محسوس کر سکتا ہے۔ یہی بات فلموں کے گانوں کی ہے جو زیادہ تر اردو زبان میں ہوتے ہیں۔ محترمہ کو اعتراض ہے کہ اردو کو ہندی کیوں کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بہت سے فلمی شاعروں کا حوالہ دیا ہے جو فلموں کے گانے اردو میں لکھتے ہیں اور وہ اردو کے شاعر ہیں، پھر جس فلم میں اُن کے گانے ہوں اُس فلم کو ہندی فلم کیوں کہا جاتا ہے۔

ہندی لفظ زبان کے علاوہ ہندستانیوں کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندستان سے جو لوگ عرب ملکوں میں کام کے لیے جاتے ہیں وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا کسی اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں، انھیں ہندی کہا جاتا ہے۔ پھر علامہ اقبال نے بھی تو کہا ہے۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندستاں ہمارا

ایسے سوال اٹھانے سے اردو زبان کو کیا فائدہ ہوگا؟

■ رضوان خاں، 96۔ شیخ سرائے، سیتاپور

''اردو دنیا'' جون 2004 زیرِ مطالعہ ہے۔ اداریے میں آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ہندستان کی Major Lingua Franca کے طور پر اردو کے رول کی اہمیت سے سبھی واقف ہیں اور اسی اہمیت کے پیشِ نظر اردو کے نام پر ووٹروں کو لبھانے کی کوشش کی گئی۔ ایک بات جو ہر شخص محسوس کرتا ہوگا، وہ یہ کہ آج ہندستان میں الیکٹرانک میڈیا کے نیوز چینل اردو الفاظ کا استعمال کثرت سے کر رہے ہیں اور ان کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال بھی ہے۔ نیوز چینلوں کی اس بھیڑ میں اگر تقابلی جائزہ لیا جائے تو وہ چینل زیادہ کامیاب ہیں جن میں زیادہ اردو الفاظ کا استعمال ہو رہا ہے۔ اردو کا کم استعمال کرنے والے چینل سیکنڈ کلاس کے لگتے ہیں۔ اس حقیقت سے اردو کی ایک بڑی لنگوا فرینکا ہونے کی بات ثابت ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا ذکر تو پہلے سے ہوتا رہا ہے کہ فلموں اور ٹی وی سیریلوں میں اردو زبان کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

قومی اردو کونسل کی خدمات فروغِ اردو اور سی بازیابی حقوقِ اردو میں بہت اہم ہیں۔ اردو دوستوں کے لیے آپ کا اداریہ Morale Booster کی حیثیت رکھتا ہے۔

■ محمد عمران راعینی، محلہ شیخ سرائے، پرانا سیتاپور

ماہ نامہ "اردو دنیا" کا مئی 2004 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ "اردو دنیا" اردو والوں کے لیے لعل و گہر سے کم نہیں، یہ اردو ادب کے لیے بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس کے تمام مضامین خاص کر "بھگوت گیتا کے اردو تراجم"، "لہو پکارے گا آستیں کا"، "اردو کی تعلیم اور روزگار کے مسائل"، "تیج اور دل"، "یہ عظیم کائنات" اور امریتا پریتم کی "دامن میں پڑی خاموشی کے سائے"، "منتخب نظمیں" بہت پسند آئیں۔ واقعی یہ رسالہ ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ علمی اور اطلاعاتی رسالہ بھی ہے۔

■ مستفیض احمد عارفی، مومن ٹولہ، مدھوبنی (بہار)

مئی کا "اردو دنیا" پڑھا۔ رسائل کی بھیڑ میں "اردو دنیا" اپنی انفرادیت منوا چکا ہے۔ مجھے ادبی، ثقافتی، معلوماتی اور اس کے دیگر مضامین بہت پسند آتے ہیں۔ "لہو پکارے گا آستیں کا" اور "جس عہدِ سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی" دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ "اردو تعلیم اور روزگار کے مسائل" بھی اچھا مضمون ہے۔

■ عبدالرشید انجم، پوسٹ باکس-70، جی پی او سرینگر-190001

"اردو دنیا" پڑھنے کو ملا۔ بہت ہی مفید ہے۔ اس میں اچھے خاصے مضامین ہر ایک موضوع پر ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک تو اردو زبان کی بھی خدمت ہوتی ہے اور دوسری طرف ہم تک انفارمیشن بھی پہنچتی ہے۔

■ محمد جلیل پاشا، چیئرمین آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی، 10-2-521، آصف نگر حیدرآباد-500028

قومی اردو کونسل کی طرف سے 2001 میں کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول نامپلی حیدرآباد میں قائم کیا گیا تھا۔ آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی کے زیرِ اہتمام چلایا جانے والا یہ سینٹر خواتین کے لیے شروع کیا جانے والا ملک کا پہلا سینٹر ہے جہاں ایک سالہ روزگار مرکوز کورس ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ ٹی۔ پی کی تربیت دی جاتی ہے۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ قومی اردو کونسل نے آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی کی زیرِ نگرانی خواتین کے لیے مخصوص ایک اور کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ ٹی۔ پی سینٹر قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کمیٹی کی میٹنگ میں کونسل کے اس فیصلے پر کونسل کا شکریہ ادا کیا گیا۔

■ امجد جاوید، علیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، ایس۔ ایف۔ ایس۔ 13، ایم آئی جی سیکنڈ سیکٹر، کے۔ ای۔ بی کالونی، وٹھل گیرہ، منزو بلال آباد، گلبرگہ

کمپیوٹر سینٹر بڑے ہی اطمینان بخش طریقے سے روز افزوں ترقی کی طرف گامزن ہے۔ آئندہ تعلیمی سال کے لیے ابھی سے لڑکے لڑکیاں آئے دن بڑی بے چینی سے داخلے کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ ٹیکنیکل عربک کورس میں داخلے سے متعلق جو اشتہار دیا گیا تھا اس کا بہت ہی اچھا رسپونس رہا۔ دو ہی دن میں پچیس طلبہ و طالبات نے داخلے لیے۔ انشاء اللہ بہت جلد مزید پچیس طلبہ کا ایک اور بیچ بھی مکمل ہو جائے گا۔

■ ایس۔ جے۔ اقبال، 239، ممتاز گل کمپاؤنڈ، گولہ گنج لکھنؤ

کونسل کی شائع کردہ کتاب "اردو شاعری: انتخاب" میں مرتبین نے تعصب، تنگ نظری اور اپنی محدود معلومات کی بنا پر حصہ نظم و غزل دونوں میں بعض ایسے شعرا تک کو شامل کیا ہے جن کی شاعرانہ قدر اور حیثیت کچھ خاص نہیں ہے۔ مثال کے طور پر غزل گویوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، مخمور سعیدی اور مظہر امام کی درحقیقت غزل گو کی کیا حیثیت ہے؟ یا ایسی کون سی قابلِ ذکر خصوصیات ان کی غزلوں میں موجود ہیں جو انھیں اس انتخاب میں شامل کیا گیا ہے؟ مجروح سلطانپوری جیسے معروف غزل گو شاعر کو فراموش کیا گیا ہے اور بھی اچھے غزل گو موجود تھے۔ حصہ نظم میں بھی بعض غیر معمولی نقائص موجود ہیں۔ نظیر اکبرآبادی، جو اردو زبان کے پہلے بڑے عوامی نظم گو شاعر ہیں، افسوس کہ انتخاب میں شامل نہیں ہیں۔ بیسویں صدی میں اقبال کے بعد جوش کو نظم گو کی حیثیت سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ اس عظیم شاعر کو شامل نہ کرکے زیادتی کی گئی ہے۔ جب کہ اختر الایمان، ندا فاضلی اور شہریار تک کو شامل کیا گیا ہے جن کے شاعرانہ قد جوش کے سامنے طفلِ مکتب سے زیادہ کچھ نہیں ہیں۔ آپ کا ادارہ ایک قومی اور سرکاری ادارہ ہے۔ ایسے انتخابات سے غریب طلبہ بجائے کچھ حاصل کرنے کے گمراہ ہوں گے۔

آپ نے "اردو شاعری: انتخاب" کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے متعلقہ سیکشن کو مطلع کردیا گیا ہے۔ جن اہم شعرا اور ادبا کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے ان کو اس کتاب کے نظرثانی شدہ ایڈیشن میں شامل کیا جانا چاہیے۔ یہ کتاب ان طلبہ کے لیے تیار کی گئی ہے جو کونسل کا اردو ڈپلوما کورس مکمل کرچکے ہیں۔ اس کتاب کو نصاب میں شامل کیا جائے یا نہیں، اس سلسلے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔

□□□

ہماری بات

حال ہی میں سی. بی. ایس. ای. کے دسویں اور بارھویں کے امتحانات کے جو نتائج آئے ہیں وہ دو لحاظ سے بے حد اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں مہنگے پبلک اسکولوں پر سرکاری اسکولوں نے بازی ماری اور دوسرے لڑکوں پر لڑکیوں نے فوقیت حاصل کی۔ تعلیمی میدان میں لڑکیوں کے لیے کامیابی کا یہ خوش گوار احساس وقت کے ساتھ ساتھ مزید توانا ہو رہا ہے۔ لڑکوں کی بہ نسبت لڑکیوں کا کسی ایک ریاست میں نہیں بلکہ پورے ملک میں گیارہ فیصد زیادہ نمبر حاصل کر کے اپنے نتائج کو مسلسل بہتر بناتے جانا محض اتفاق نہیں ہے۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ لڑکیاں پڑھائی کو زیادہ سنجیدگی سے لیتی ہیں۔ وہ زیادہ محنت کرتی ہیں۔ ان کے ان بہتر نتیجوں کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ اعلا طبقے کے ایک چھوٹے حصے کو چھوڑ دیں تو لڑکیوں پر پڑھائی لکھائی کے ساتھ ساتھ گھریلو کاموں کی ذمّے داری بھی ہوتی ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جہاں ملک کی راجدھانی کے لڑکے مقابلتاً پھسڈی ثابت ہوئے، وہاں ملک بھر میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والی دونوں لڑکیاں دہلی کی ہیں۔

اس بار کے سی. بی. ایس. ای. کے نتائج کا ایک اہم مثبت پہلو یہ ہے کہ سرکاری اسکولوں کے طلبہ کے نتائج میں کافی سدھار ہوا ہے۔ دہلی میں سرکاری اسکولوں کے طلبہ نے سرکاری امداد یافتہ اسکولوں سے بھی کچھ زیادہ (77.15 کی بہ نسبت 77.82) کامیابی حاصل کی۔ راجدھانی کے سینٹرل اسکولوں نے 97.49 فیصد رزلٹ دے کر ریکارڈ قائم کیا ہے۔

یہ خیال عام طور سے لوگوں کے ذہن میں گھر کر گیا ہے کہ سہولیات سے بھرپور مہنگے اسکولوں کے طلبہ ہی امتحان میں اوّل رہتے ہیں۔ سی. بی. ایس. ای. کے نتائج نے اس نظریے کو باطل قرار دے دیا ہے۔ سرکاری اور سرکاری امداد یافتہ اسکولوں کے نتائج نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محدود سہولیات والے اسکول بھی بہتر انتظام و انصرام کی بنا پر اچھے نتائج دے سکتے ہیں۔ سینٹرل اسکول اور عام طور سے دیہی علاقوں میں چلنے والے جواہر نودے ودیالیوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بہتر ہی نہیں، اعلاترین نتائج دے سکتے ہیں۔ اس بار سینٹرل اسکولوں اور نودے ودیالیوں کے امتحانات کے نتیجے بالترتیب 92.62 اور 87.68 رہے جو ایک ریکارڈ ہے۔ سینٹرل اسکولوں نے اس بار چار فیصد بہتر نتائج دیے ہیں۔ اس بار دیہی علاقوں کے طلبہ مشکل حالات کے باوجود آگے رہے ہیں۔ یہ مستقبل کے لیے ایک خوش کن علامت ہے۔

اس بار دسویں کے امتحانات میں جہاں جواہر نودے ودیالیہ نے بازی ماری وہیں بارھویں کے نتائج میں سینٹرل اسکول سرِ فہرست رہا۔ دونوں امتحانات میں پبلک اسکول تیسرے یا چوتھے نمبر پر رہے۔ جواہر نودے ودیالیہ اور سینٹرل اسکول آدھے سے زیادہ دیہاتی علاقوں میں ہیں۔ ان اسکولوں میں فیس چونکہ نہیں کے برابر ہوتی ہے اس لیے ان میں ہر طبقے کے بچے پڑھتے ہیں جبکہ پبلک اسکولوں میں امیروں اور اعلا افسران کے ہی بچے پڑھتے ہیں کیوں کہ غریبوں کے لیے ان کی مہنگی فیس ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔

ان نتائج نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پبلک اسکول ہی پڑھائی کا بہتر ذریعہ نہیں ہیں بلکہ سرکاری اسکولوں میں بھی ایک اچھا طالب علم تیار کرنے کے تمام امکانات موجود ہیں۔ سرکاری اسکولوں میں بنیادی سہولیات کی کمی دور کر دی جائے، اساتذہ کی خالی پوسٹوں پر تقرری کر دی جائے اور استاد طالب علم کا تناسب سدھار دیا جائے تو وہ پرائیویٹ اسکولوں سے ہر معاملے میں بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔

ان نتائج سے ایک بات واضح ہو گئی ہے کہ مڈل کلاس کے لوگوں کو اب پبلک اسکولوں کے پیچھے بھاگنے کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور بچوں کو سرکاری اسکولوں میں پڑھانے پر وہ احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں۔ سرکاری اسکولوں کے بارے میں بھی لوگوں کو اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔ تعلیمی میدان میں بہتری آ رہی ہے اور اس کے اثرات نظر آنے لگے ہیں۔ یہ مثبت اشارے صرف سیکنڈری ایجوکیشن تک ہی نہیں بلکہ اعلا تعلیم میں بھی نظر آتے ہیں۔ میڈیکل، انجینئرنگ، چارٹرڈ اکاؤنٹنسی، آرکیٹکٹ وغیرہ تعلیمی میدانوں میں آج بھی سرکاری اداروں کا ہی بول بالا ہے اور ان کی اہمیت پوری دنیا میں ہے۔

سرکاری اسکول صحیح سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں لیکن ابھی ان میں مزید سدھار کی گنجائش ہے۔ ابتدائی تعلیم کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے استاد طالب علم کے تناسب کو سدھارنا ہوگا۔ سرکاری اسکولوں میں تقریباً چالیس طلبہ پر ایک استاد ہے جبکہ پرائیویٹ اسکولوں میں یہ تناسب پچیس ہے۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ پرائیویٹ اسکول زیادہ فیس لیتے ہیں، وہ داخلے کے لیے طالب علم کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کی ذہنی سطح کی جانچ کرتے ہیں جبکہ سرکاری اسکولوں کو سبھی طلبہ کو داخلہ دینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بھی ان کے نتائج اچھے ہو رہے ہیں تو بلاشبہ یہ ایک خوش آئند علامت ہے۔ نئی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ جی. ڈی. پی. کا چھ فیصد تعلیم پر خرچ کرے گی۔ مرکزی وزیر برائے ترقیِ انسانی وسائل جناب ارجن سنگھ نے اس جانب خصوصی توجہ دی ہے۔ انھوں نے تمام ریاستی اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کے وزرائے اعلا کو خط لکھا ہے کہ موسمِ گرما کی تعطیلات کے بعد جیسے ہی اسکول کھلیں، ان تمام بچوں کو اسکول میں واپس لانے کی مہم چلائی جائے جو کسی نہ کسی وجہ سے ڈراپ آؤٹ کا شکار ہو گئے ہیں۔ 6 سے 14 سال کے بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم نہ صرف ان کا بنیادی حق ہے بلکہ ہر بچے کو اسکول پہنچانا اخلاقی اور آئینی ذمّے داری بھی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جناب ارجن سنگھ نے تمام وزرائے اعلا کو صلاح دی ہے کہ وہ سبھی ضلع کلکٹروں کو ہدایات جاری کریں کہ وہ پنچایتوں، اساتذہ، دیہی تعلیمی کمیٹی (گرامین شکشا سمیتی) کے ممبران اور غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ مل کر بچوں کا داخلہ کرانے کے لیے موبلائزیشن پروگرام چلائیں۔ وزیرِ موصوف نے یہ عندیہ بھی دیا ہے کہ وہ اساتذہ کی تقرری، نئے اسکولوں کے قیام اور کلاس روموں کی تعمیر کا جائزہ بھی لیں گے۔

امید ہے کہ اب ''سب کو تعلیم'' کا خواب جلد ہی شرمندۂ تعبیر ہوگا اور ہمارا ملک صد فیصد خواندگی کے نشانے کو پار کر سکے گا، لیکن یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام بھی بڑھ چڑھ کر اس مہم میں حصہ لیں اور اپنے بچوں کو گھر کے کام کاج میں لگانے کی بجائے اسکول بھیجیں اور ایک نئے ترقی یافتہ ہندستان کی تعمیر میں اپنا مؤثر رول ادا کریں۔

سید علی محمد خسرو

اُردو کی تہذیبی معنویت

ہندستان کے پچھلے ایک ہزار برس میں سنسکرت، عربی، فارسی، ہندی اور اردو زبانوں کے باہمی تعلقات کی تاریخ چار دوروں میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔

1- پہلا دور کم و بیش بارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ سلطنتوں کے دربار سجتے ہیں۔ ان سلطنتوں کے گورنر اور منتظمین ملک کے مختلف حصوں میں پھیلتے ہیں۔ ان سلطنوں اور کچھ بعد مغل بادشاہوں کی فوجیں جن میں فارسی بولنے والے سپاہیوں کی کثرت ہے۔ ملک کے مختلف علاقوں میں جاتی ہیں۔ بازار لگتے ہیں، کاروبار ہوتے ہیں، فارسی کا میل ہندی بلکہ یوں کہیے ہندی کی مختلف شکلوں سے ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ہریانوی میں فارسی کا میل، کھڑی بولی میں فارسی کا دخل، پوربی میں فارسی کی ملاوٹ اور دکنی زبانوں میں فارسی کا چلن، چونکہ فارسی بولنے والے لشکر یا اردو، جنوبی ہند کو چھوڑ کر دیس کے باقی برصغیر میں پہنچ رہے تھے۔ اس لیے فارسی کا اثر شمالی ہند، گجرات، بنگال اور دکن کی ساری ہی زبانوں پر ہورہا تھا، مثلاً پچھلے دنوں میں نے گجرات کے شہر آنند میں ایک جلسۂ تقسیم اسناد میں کچھ تقریریں گجراتی میں سنیں اور حسب ذیل فارسی الفاظ کو نوٹ کیا: حقیقت، ضروریات، صاحب، سرکاری، عمدہ، ضرور، تعلیم، ظاہر، مدد، بابت، نام، پسند، آخری، یاد......
وغیرہ۔ بحیثیت مجموعی لسانی رشتوں کا یہ پہلا دور فارسی اور ہندی کے امتزاج نزدیکی اور Convergence کا دور ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں امیر خسرو جیسے فنکاروں کا کام زبانوں کو آپس میں ملاتا ہے اور مثال کے طور پر ایسی غزل پیدا کرسکتا ہے جس میں ایک طرف ہندی اور دوسری طرف فارسی کے مصرعے ہیں:

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں
چوں تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بہ صد فریبم بہ بردتسکیں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف زمانِ وصلت چو عمر کتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اس دور میں اردو زبان جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ صرف ہندی کی مختلف شکلیں ہیں اور فارسی ہے۔ اور ان دونوں کا ساجھا ہوتا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ فارسی ہندی کا یہ امتزاج صرف الفاظ، محاورات اور طرز ادا تک محدود ہے۔ مگر ہندی گرامر اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور بدلنے نہیں پاتی۔

2- جب اس دور کے کئی سو سال گزر جاتے ہیں تو ایک دوسرا دور شروع ہوجاتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں شہروں، بازاروں، فوجوں، درباروں، عدالتوں، انتظامیہ، تجارت اور صنعت میں فارسی کا چلن کم ہوتا جاتا ہے اور اس کی جگہ وہ ہندی لینے لگتی ہے جس پر پچھلے دور میں فارسی کا کافی اثر چڑھ چکا تھا۔ اس دور میں ہندی کی دو شکلیں ہوجاتی ہیں۔ ایک وہ ہندی جو دیہات میں رہی اور اس میں کہانیوں، پہیلیوں، محاوروں، کہاوتوں اور لوک گیتوں وغیرہ کی ایجاد ہوتی رہی۔ دوسری وہ ہندی جو شہروں میں آگئی اور فارسی کو دھیرے دھیرے بے دخل کرکے عوام کی زبانوں پر چڑھنے لگی۔ مگر فارسی ہی زبان سے اور کہیں کہیں عربی سے لفظوں اور محاوروں کو لے کر اور اصطلاحات وضع کرکے ہندی میں ضم کرنے لگی، فارسی اور عربی سے لی ہوئی یہ اصطلاحات وہ تھیں جن کی بازاری کاروبار، تجارت وصنعت، قانون و عدالت میں، انتظام مملکت میں، دفتروں میں، درباروں اور فوجوں میں ضرورت تھی۔ شہری ہندی میں جوں جوں ان اصطلاحات کی بہتات ہوتی گئی اور شہری ثقہ پن یعنی Sophistication بڑھتا گیا۔ شہری ہندی اور دیہاتی ہندی کا فرق بڑھتا گیا اور شہری ہندی کو "ریختہ" یا "اردو" کہنے لگے کیونکہ شروع میں فارسی اور ہندی کا یہ امتزاج لشکروں یعنی اردو ہی سے شروع ہوا تھا۔ یہ دوسرا دور اردو اور ہندی کے بعد یعنی دوری اور Divergence کا دور ہے۔ یہ دور کوئی ڈھائی تین سو سال کا دور ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام اور وضع اصطلاحات اور ان اصطلاحات کے

● سید علی محمد خسرو ملک کے ممتاز ماہرینِ معاشیات میں سے تھے۔ انھیں اردو زبان و ادب سے بھی گہرا شغف تھا۔ 1987 میں انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں خواجہ غلام السیدین میموریل لیکچر دیا تھا جس میں انھوں نے اردو کی تہذیبی معنویت پر گہرائی سے روشنی ڈالی تھی اور موجودہ مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا رشتہ بڑی خوبی سے معاشی وجوہ سے ملایا تھا۔ اس لیکچر کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر کیا جارہا ہے۔

چلن پر ختم ہوتا ہے۔

3- آزادی کے بعد لسانی رشتوں کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں ہندی کو ہندستان کی سرکاری زبان بنایا جاتا ہے اور یہ زبان دیہات سے چل کر شہروں اور دفتروں میں پہنچ جاتی ہے۔ شروع شروع میں اس زبان کے سمجھنے میں کسی کو کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی۔ مگر جب فنی، سائنسی اور تکنیکی ضروریات کے تحت نئی اصطلاحات کی ضرورت پڑی، جو پڑنی تھی تو اب بجائے فارسی کے سنسکرت سے استفادہ کیا جانے لگا اور بڑی تعداد میں اس زبان کے الفاظ ہندی میں نافذ کیے گئے۔ چونکہ سنسکرت بھاشا ہزار سال سے زیادہ سے لوگوں کی زبان پر جاری نہیں تھی اور اپنے عروج کے زمانے میں بھی وہ عوام کی نہیں بلکہ خواص کی زبان تھی، علم کی زبان تھی اور علم عام نہیں تھا، اس لیے سنسکرت الفاظ و اصطلاحات کے ہندی میں داخل کیے جانے سے ہندی کے بولنے، لکھنے اور سمجھنے میں آسانی کا سامان فراہم نہ ہوسکا۔ بہرحال یہ وہ دور تھا جس میں ہندی اور اردو میں پہلے سے زیادہ دوری ہوگئی۔ پچھلے ڈھائی سو سال میں فارسی عربی کی اصطلاحات اور الفاظ و اصطلاحات کے لیے جانے سے یہ تفاوت اور بڑھ گیا۔ یہ ہندی اردو کی دوری کا یعنی Divergence کا دور تھا۔

4- ادھر کوئی دس پندرہ سال سے ایک چوتھا دور شروع ہوا ہے جو اردو اور ہندی کی نزدیکی یا Convergence کا دور ہے۔ اس دور میں یہ زبانیں بڑی حد تک ایک دوسرے سے قریب ہوتی جارہی ہیں، اگرچہ ٹیکنیکل ٹرمنالوجی یعنی فنی اصطلاحات کے میدان میں فرق اور فاصلہ پہلے سے زیادہ ہے۔ اول تو اردو والے ہندی کو زیادہ سیکھنے لگے ہیں۔ دوسرے لاکھوں بچے جن کی مادری زبان اردو ہے، اسکولوں میں ہندی پڑھ کر نکل رہے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہندی کی بہت ساری کہانیاں اور کچھ کویتائیں اردو رسم خط میں لکھی جارہی ہیں اور اردو والے ان کو پڑھنے لگے ہیں۔ چوتھے ہندی کی کچھ بحروں کو اردو والوں نے اپنا لیا ہے اور اردو شاعری کا حصہ بنالیا ہے لیکن دراصل میل جول کی صورت ہندی کی طرف سے اب زیادہ پیدا ہونے لگی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہندی اور اردو کی گرامر ایک ہے جو یگانگت اور ایکتا کا سب سے بڑا اور مستقل سبب ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندی میں خود اعتمادی کے بڑھ جانے سے اردو کے Sophistication یعنی شستہ پن کو ہندی والے اب پہلے کی نسبت زیادہ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ خاص طور پر اس لیے کہ ہندی خود شہروں میں آکر اسی Sophistication اور شستہ پن سے گزرنے لگی ہے جس سے اردو پہلے گزر چکی ہے۔ جس طرح شہری، تجارتی، صنعتی اور دانشورانہ ماحول کا اثر اردو پر پڑچکا تھا وہ اب ہندی پر بھی پڑ رہا ہے۔ ایک بہت بڑی قربت دونوں زبانوں میں اسی وجہ سے ہونے لگی ہے۔

اُردو کی رواداری اور کُل پسندی

شروع ہی سے اردو زبان کی بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ اس نے دوسری زبانوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑا اور امتزاج پیدا کیا، دوسری زبانوں کے ساتھ بامروت اور دوستانہ تعلقات رکھے اور ان کے الفاظ کو جذب کرکے اپنے آپ کو مضبوط بنایا۔ اس طرح جب اردو خود ایک روادار زبان بن گئی تو اس نے قومی اور انسانی رواداری اور یکجہتی کے خیالات کو فروغ دیا۔ آیئے پہلے زبان ہی کی سطح پر دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کی اپنی رواداری اور امتزاج کے کیا معنی ہیں؟

مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب "آب حیات" میں ایک جگہ دلّی کے ایک شریف زادے کی بات چیت نقل کی ہے۔ یہ لڑکا بڑی روانی سے یہ کہتا ہے:

"میں بازار سے سیکل پر بیٹھ کر چلا، گھر پہنچا، چق اُٹھائی، کمرہ میں داخل ہوا، کمرے میں میز کرسی رکھی تھی، لیمپ جل رہی تھی، میں کرسی پر بیٹھ گیا۔"

اب ان جملوں کی ترکیب دیکھیے، پہلے تو ان کی گرامر ہندی اور جملوں کی بنیاد یعنی افعال سب ہندی ہیں۔ مثلاً میں چلا، گھر پہنچا، اُٹھائی، رکھی تھی، جل رہی تھی، بیٹھ گیا، باقی بازار فارسی، سیکل انگریزی، گھر ہندی، چق ترکی، کمرہ اطالوی، داخل عربی، میز پرتگیز، کرسی فارسی، لیمپ انگریزی یہ امتزاج یعنی Integration بھی عجیب وغریب ہے۔ اردو نے بے تکلفی کے ساتھ تمام بھاشاؤں سے شہد لیے، ان کو ایک لڑی میں پرویا ان کی مالائیں اور سمرن بنائے، گلوں اور ہاتھوں میں ان کو پہنایا اور دلوں میں ان کو اُتارا۔ دیکھیے زبان کا پھیلاؤ اور Integration کس طرح سے ہوتا ہے اور Sophistication کیسے بڑھتا ہے۔ Integration زبان کو شدھ رکھنے سے نہیں ہوتا، بھاشا کو Inward-Looking یعنی اپنے ہی اندر گھٹی رکھنے سے نہیں ہوتا بلکہ نئے شبدوں، محاوروں اور طرز بیان کو اپنانے، اپنی زبان میں ضم کرنے اور ان کا فائدہ اُٹھانے سے ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کے ساری دنیا میں پھیل جانے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سری نگر، شملہ اور چنڈی گڑھ سے بنگلور اور حیدرآباد تک اور پٹنہ اور بنارس سے جے پور، احمد آباد اور ممبئی تک کروڑوں لوگ گلی کوچوں میں روزمرہ کی زبان بول رہے ہیں اور مزے سے ایک دوسرے کی بات سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھاشا سرکاری بھاشا نہیں ہے بلکہ کئی سو برس کے امتزاج اور استعمال کا نتیجہ ہے۔ جب اردو

اپنے آپ کو دوسری بھاشاؤں کے سیکڑوں ہزاروں الفاظ و محاورات کو اپنے اندر ضم کرکے اپنے آپ کو مالا مال بنا چکی تو اس نے اس رواداری کے رجحان کو باقی رکھتے ہوئے ایسا طرز بیان اپنے اندر پیدا کیا کہ اس کا جواب مشکل سے ملتا ہے۔ ترسیل یعنی Communication کا سلیقہ اس زبان سے بہم پہنچایا اور لین دین کے ایسے طریقے ایجاد کیے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کی جگہ بننے لگی اور عوام نے دھیرے دھیرے اردو کو اپنا کر قاری کو بے دخل کردیا۔ اردو کے اکثر و بیشتر شعرا اور مصنف Communicate کرنے اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے بلکہ دل نشیں کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔

مشکل پسندی اور مشکل گوئی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے برخلاف آسان گوئی کو سراہا جاتا ہے اور فصاحت، سلاست، روانی اور سہل البیانی کی تعریف کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو نظم اور نثر کے لکھنے والوں میں مشکل گو اور مغلق لکھنے والے بھی ملتے ہیں۔ خود مرزا غالب کے کئی اشعار مشکل گوئی کا نمونہ ہیں:

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

یا یہ کہ:

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

واقعی کتنا اچھا لیکن کتنا مشکل شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب مرزا غالب کی مشکل پسندی پر طعنے کسے جانے لگے اور شکایت مرزا تک بھی پہنچی تو انھوں نے وہ مشہور قطعہ کہا:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

چند مشکل پسندوں سے قطع نظر اردو کے ادیبوں اور شعرا نے اور دوسرے بولنے اور لکھنے والوں نے اگر ایک طرف بڑی تعداد میں دوسری زبانوں سے الفاظ و محاورات اخذ کیے اور ان کو بار بار استعمال کرکے جلا دی تو دوسری طرف فن ترسیل یا Communication کے ذریعے دوسروں تک اپنی بات پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بات وہ اچھی سمجھی جاتی تھی کہ دل سے نکلے اور دل تک پہنچ جائے، بلکہ دل نشیں ہو جائے۔ مولوی علی حیدر نظم طباطبائی نے جو Gray's Elegy کے ترجمے کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہوئے۔ ایک جگہ شعر کی تنقید کے سلسلے میں لکھا ہے۔ "جس شعر کے معنی میں الجھن پڑ جائے اور نکتہ سنج طبیعتیں اس کی تفسیر میں بحث کرنے لگیں۔ سمجھ لو شاعر ادا نہ کرسکا۔" دل کی بات دل تک پہنچانے کا فن اردو والوں میں بڑا ہر دلعزیز ہوا۔ یہاں تک کہ سہل ممتنع کو نظم کی اعلا صفت سمجھا جانے لگا۔ سہل ممتنع یعنی Limiting Case of Simplicity نظم کی وہ خصوصیت ہے کہ اگر اس نظم کو نثر میں تبدیل کرنا چاہیں تو نہ کرسکیں۔ اساتذہ شاگردوں کی غزلوں اور نظموں کی اصلاح میں سہل ممتنع کی تلقین کرتے تھے اور خود بھی اس روش پر چلتے تھے۔ مثلاً داغ دہلوی:

سب لوگ جدھر وہ ہیں اُدھر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں
کچھ دیکھ رہے ہیں دل بسمل کا تڑپنا
کچھ غور سے قاتل کا ہنر دیکھ رہے ہیں

یا ایک اور جگہ:

عذر آنے میں بھی ہے، پاس بلاتے بھی نہیں
باعث ترک ملاقات بتاتے بھی نہیں
خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

میر تقی میر زبان کے چٹخارے کے ساتھ سہل بیانی کا کمال یوں دکھاتے ہیں:

یوں پکاریں ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے
ادھر آبے! ابے او چاک گریباں والے

یا پھر یہ کہ:

میں دشمن جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا
سو حضرت دل سلمہ اللہ تعالیٰ

صرف دہلوی شعرا کی بات نہیں شاعر دلی کا ہو یا لکھنؤ یا کسی اور جگہ کا۔ توجہ بہرحال ترسیل اور Communication ہی کی طرف ہوگی۔ چنانچہ بزم لکھنوی کہتے ہیں:

کچھ کو کس نے لیا دل کو جو پایا نہ گیا
یاں ہمیں تم ہیں کوئی اور نہ آیا نہ گیا

اس غزل میں نعتیہ شعر کس روانی سے کہے گئے ہیں:

ایک شب عرش پہ محبوب کو بلوا ہی لیا
ہجر وہ غم ہے خدا سے بھی اُٹھایا نہ گیا

سہل بیانی کے سلسلے میں غالب جیسے مشکل پسند کو بھی مشکل پیش آئی اور آسان بیانی کی طرف جھکنا پڑا چنانچہ:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

بہر حال اردو شاعری میں سطحوں کے سطحے اور دیوان کے دیوان سہلِ ممتنع سے بھرے پڑے ہیں۔ میر انیس کے ایک بند میں جو ایسے ہزاروں بندوں میں سے ایک ہے سہل البیانی ملاحظہ فرمایئے:

اک بھائی کے مرتے ہی بڑھا دوسرا بھائی
اس نے بھی لڑائی میں بہت جان لڑائی
مہلت نہ مگر ہاتھ سے نوشاہ کے پائی
آیا وہ اُدھر سے کہ اِدھر سے اجل آئی
ڈھونڈا کیے قاسم بھی کہ کیا ہوگیا دشمن
اک برق سی چمکی کہ فنا ہوگیا دشمن

یا ایک اور بند کی سلاست دیکھیے:

جنگ میں تیغ کو دعوا تھا کہ یکتا ہوں میں
سر اُٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا ہوں میں
چرخ کہتا تھا کہ یا رب تہ و بالا ہوں میں
برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یہ یا ہوں میں
کس کی ہے یہ جو تڑپ زیرِ فلک میری ہے
تیغ کرتی تھی اشارہ یہ چمک میری ہے

سہلِ ممتنع کی بہترین مثالوں میں سے ایک مثال استاد ذوق کی ایک غزل ہے۔ ساری غزل کا ایک ہی مزاج ہے کہ زندگی اور موت کے بنیادی مضامین پر ایک فلسفہ بیان کیا گیا، وہ بھی اس درجہ سلاست کے ساتھ کہ ایک لفظ اِدھر کا اُدھر نہیں ہوسکتا اور نظم کو نثر نہیں کیا جاسکتا۔ آپ سب حضرات اس غزل سے پوری طرح واقف ہیں لیکن سہلِ ممتنع کی اعلا مثال کے طور پر اس کو پھر ملاحظہ فرمایئے:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دُنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
دُنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

آسانیِ بیان اور سہلِ ممتنع کی یہ روش صرف متقدمین اور متاخرین ہی تک محدود نہ تھی بلکہ حالیہ دور میں بھی جاری ہے آج بھی اُردو والوں میں Communication پر بہت زور ہے۔ مثلاً رگھوپتی سہائے فراق جو کچھ دنوں پہلے تک ہمارے ساتھ تھے، فرماتے تھے:

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا
منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا
لاکھ کر ظلم و ستم لاکھ کر الطاف و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

عدم کہتے ہیں:

اس طرح عہدِ شباب آکے گزر جاتا ہے
جس طرح رنگ کھلونوں سے اُتر جاتا ہے
یوں تو ملتا ہی نہیں گھر سے کسی وقت عدم
شام کے وقت نہ معلوم کدھر جاتا ہے

یا پھر عدم ہی کے شعر:

آ اے غمِ دوراں در سے خانہ ہے نزدیک
آرام سے بیٹھیں گے ذرا بات کریں گے
جنت میں نہ مے ہے نہ محبت نہ جوانی
کس چیز پہ انساں بسر اوقات کریں گے
کہہ دو یہ عدم سے کہ خراجات میں کل رات
کچھ لوگ فقیروں کی مدارات کریں گے

یا احمد فراز کے مشہور اشعار:

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

یا ان ہی کا ایک اور شعر پیش ہے:

سانسوں میں بھی شامل ہو لہو میں بھی رواں ہو
لیکن مرے ہاتھوں کی لکیروں میں کہاں ہو

بہرحال اپنی بات کو سلاست اور فصاحت کے ساتھ اس طرح کہنا کہ دل سے دل کا معاملہ ہو جائے تہذیب کا ایک اہم پہلو ہے اور اُردو نے اس خاصیت کو اپنا مزاج بنا رکھا ہے۔ چاہے اور زبانیں اپنے آپ کو کتنا ہی شدہ اور وقت پسند بنالیں لیکن اُردو کو اپنی آسان اور Communication والی روش پر چلتے ہی رہنا ہے:

ان کی طبیعت ان کی طبیعت ہوا کرے
قاصد مرا مزاج بھی میرا مزاج ہے

خود یہ شعر بھی سہل ممتنع ہی کی تعریف میں آتا ہے۔

خواتین و حضرات، میرا یہ ایقان ہے کہ ہندستان کے مختلف علاقوں، زبانوں، نسلوں اور مذاہب کے درمیان اگر رواداری کو قائم کرنا اور بڑھانا ہے اور قومی یکجہتی کی فضا کو ہموار کرنا ہے تو اُردو زبان سے بہتر کوئی حربہ اس کارِ عظیم کے کرنے کا نہیں ہے۔ اُردو کے ساتھ ساتھ اگر کوئی اور زبان ہے جو قومی یکجہتی کا کام کرسکتی ہے تو وہ ہندی زبان ہے۔

اگر چہ جس قسم کی ہندی پچھلے 35 یا 40 سال سے اس ملک میں بڑھاوا پا رہی تھی اس کے بارے میں بھروسے کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ یکجہتی کو بڑھانے کی زبان ہوگی۔ ایک طرف تو یہ زبان بجائے رواداری کے کٹر پن کی طرف جارہی تھی اور بجائے دوسری زبان سے الفاظ اخذ کرنے کے Parism یعنی شدہ پن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ حکومتی پالیسی کچھ ایسی دکھائی دیتی تھی کہ بجائے لوگوں کے دلوں میں ازخود گھر کر لینے کے کئی علاقوں میں اس زبان کو لوگوں پر تھوپا جارہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے کئی حصوں، خاص کر دکھنی بھارت میں اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہوا اور اس کو روکنے کے لیے دیواریں اور فصیلیں کھڑی کرلی گئیں مگر ادھر پانچ سات سال سے ہندی میں جو نئے رجحانات پیدا ہورہے ہیں اور دوسری زبانوں سے الفاظ حاصل کرکے اپنے کو مالا مال کرنے کی جو روش چل پڑی ہے اور اپنے شہری جنم میں جس Sophistication یا ثقہ پن سے ہندی گزر رہی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ہندی کا بھی وہی رنگ ہوگا جو اُردو کا ہے اور لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے اور قومی یکجہتی کو بڑھانے کے بڑے کام یہ زبان بھی اسی طرح کرسکے گی جیسے کہ اُردو کرتی آئی ہے مگر یہ بھی صحیح ہے کہ جب ہندی اس موقف میں آئے گی کہ قومی یکجہتی کے کام کو کرسکے تو اس کی شکل اس ہندی سے بہت ملتی جلتی ہوگی۔ بلکہ جڑواں بہنوں کی طرح ہوگی یا ایک سی ہوگی سوائے اس کے کہ ان کی تکنیکی لباس اور فن اصطلاحات کے دائرے میں ان کا رنگ الگ الگ ہوگا۔

اُردو شعرا اور ادیبوں کے ثقافتی معیار
منافقت اور کٹر پن سے بیر

پچھلے کئی سو برس میں جب اُردو زبان اپنے آپ کو دوسری زبانوں کے الفاظ، محاورات اور طرزِ ادا کے ذخیروں سے مالا مال کررہی تھی اور خود اپنی رواداری کو مستحکم کررہی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ وہ قومی رواداری بلکہ انسانی رواداری اور یکجہتی کا ایک زبردست آلۂ کار بن بیٹھی تھی۔ یوں کہیے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اندرونی امتزاج یا Integration کو مضبوط کررہی تھی تو دوسری طرف قومی اور انسانی امتزاج کا سامان مہیا کرکے باہر کی فضا کو سازگار بنا رہی تھی۔ یکجہتی اور رواداری کی یہ روش اردو پر کہیں باہر سے تھوپی نہیں گئی اور نہ رواداری کسی پر تھوپی یا لادی جاسکتی ہے۔ اُردو کا یہ دوستانہ مزاج اس کی اپنی اندرونی اُپج ہے اور روزِ اوّل ہی سے اس کی ساخت اور اُٹھان کا ایک اہم حصہ ہے۔ ''مرا مزاج لڑکپن سے دوستانہ تھا۔'' شروع ہی سے اُردو زبان رومی کے اس شعر کی جیتی جاگتی تصویر رہی ہے کہ

تو برائے وصل کر دن آمدی
یا برائے فصل کردن آمدی

اُردو کی بے تعصبی کا جائزہ لیتے وقت یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ اس کے شعراء ادیبوں اور مصنفین نے کٹر پن اور تعصب سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ نہ ان کو مذہب سے بیر تھا نہ علمائے مذہب سے۔ فقیری اور صوفی منشی کے تو وہ دلدادہ تھے۔ اگر بیر تھا تو ان کو کٹر پن سے تھا۔

دین و مذہب کے نام پر ڈھکوسلے اور منافقت کو وہ سہہ نہ سکتے تھے، اُردو شاعر چاہے کسی دور کا ہو شیخ و برہمن پر طعنے کسے گا، ریاکار واعظ پر لعنت بھیجے گا، زاہد خشک کا مذاق اُڑائے گا، محتسب سے نفرت کرے گا اور ناصح کی نصیحتوں کو ٹھکرا دے گا۔ مسجد و بُت خانہ حرم و دیر دونوں ہی سے وہ بیزاری کا اظہار کرے گا اور میخانے کو اپنی منزل مقصود سمجھے گا۔ اُردو شاعر کا اعتراض مذہب پر نہیں ہے بلکہ چند مذہبی اجارہ داروں کی دو عملی، کٹر پن، تعصب اور منافقت پر ہے۔

یہ مسجد ہے وہ میخانہ، تعجب اس پہ آتا ہے
جناب شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

ہنسی شاعر کو اس پر آتی ہے:

پہلے تو آکے شیخ نے دیکھا اِدھر اُدھر
پھر سر جھکا کے داخلِ میخانہ ہوگیا

واعظ کے وعظ سے وہ بیزار ہے اور ناصح کی نصیحتوں نے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔

شیخ و برہمن، واعظ و ناصح، زاہد و محتسب سب کے خلاف میر تقی میر سے فیض احمد فیض تک اُردو شعرا نے آواز اٹھائی ہے اور طنز و مزاح کے پردے میں ان سب کی پگڑیاں اُچھالی ہیں۔ چنانچہ ایک ستھری غزل میں جس کا مطلع ہے:

مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میر کی شب کو
مدت تلک اک وجد کی حالت رہی سب کو

میر جی فرماتے ہیں:

برسوں تئیں جب ہم نے تردد کیے ہیں تب
پہنچایا ہے آدم تئیں واعظ کے نسب کو

ایک اور جگہ:

شیخ جی آؤ مصلیٰ گرو جام کرو
مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
سایۂ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
آپ کو لچوں کے قابلِ دشنام کرو
جاکے تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستاں میں بھی شام کرو

ناصح اور واعظ کے تو شعرا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئے:

واعظا، چھوڑ ذکر نعمتِ خلد
کر شراب و کباب کی باتیں

مصحفی اپنے محبوب سے کہتے ہیں:

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

مرزا داغ جب بڑی دیر تک ناصح کی نصیحت سن چکے تو کہنے لگے:

ناصحا تو بھی کسی پر جان دے
ہاتھ لا اُستاد! کیوں؟ کیسی کہی!

شیخ اور محتسب کے بارے میں فیض کا رویّہ پہلے تو ڈھٹائی کا ہے:

شیخ سے بے حجاب ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

مگر پھر یہ شکایت ہے کہ:

کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کمتر جاتی ہے

یکجہتی، بے تعصبی اور کشادہ دلی

اس قسم کے ایک حد تک منفی طنز و مزاح اور بیزاری سے ہٹ کر ہر زمانے کے اُردو شعرا نے رواداری، یکجہتی، بے تعصبی اور کشادہ دلی کی جو مثبت تلقین کی ہے اور یکسانیت، رفاقت اور دردمندی کا جو فلسفہ ایجاد کیا ہے اس کے مدِ نظر تو میں اس لکچر کا عنوان "اردو کا دوستانہ مزاج" رکھنا چاہتا تھا مگر چونکہ مجھے دوستانہ مزاج کے علاوہ اُردو شعر و نثر کی کچھ اور خصوصیات حاضرین کے گوش گزار کرنی تھیں اس لیے عنوان وہ رکھا جو اب ہے۔ فی الحال یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو اپنے اندر رواداری اور دردمندی کی صفت نہیں رکھتا وہ مہذب نہیں ہوسکتا۔ تہذیب کے لیے رواداری شرط ہے اور مہذب وہی ہوگا جو روادار اور Tolerant ہوگا۔ ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیش خدمت ہے کہ قومی یا انسانی یکجہتی کی مہم کو چلانے کے لیے چلانے والے کے لیے لازم ہے کہ وہ خود بھی یکجہتی کا مزاج رکھتا ہو اور انصاف پسند شخصیت کا حامل ہو۔ جو خود Integrate نہ ہو چکا ہو وہ دوسروں کو کیا Integrate کرسکتا ہے:

او در خویشتن گم است کجا رہبری کند

اُردو کے ادیب اور شاعر اور اس کے بولنے اور ماننے والے عام طور پر اس خیال کے حامی رہے کہ اپنے مسلک کو مضبوطی سے پکڑے رہنا چاہیے لیکن دوسروں کو بھی اس کے مسلک پر چلنے کا پورا حق دینا چاہیے۔ جب اس بات کو مان لیا جائے کہ دوسرے کو اپنے مسلک پر چلنے کا پورا حق ہو تو رواداری کا راستہ خود ہی قائم ہوجاتا ہے۔ غالب نے اس نکتے کو کس خوبی سے سمجھایا ہے کہ ایمان کا یہ مقصد نہیں ہے کہ صرف اپنی روش کو ایمان اور دوسرے کی روش کو بے ایمانی سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک برہمن دل کی لگن کے ساتھ اپنے بُت کی سیوا کرتا رہا اور اپنے مسلک کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے بُت خانے ہی میں مر گیا تو اس قابل ہے کہ کعبے میں دفن کیا جائے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اپنی بات پر قائم رہنے اور دوسرے کے ساتھ رواداری برتنے کے مضمون کو دکن کے ایک صوفی شاعر غالباً حسین شاہ ولی نے کس عمدگی سے دلنشیں کیا ہے۔ کہتے ہیں:

کفر کافر کو بھلا شیخ کو اسلام بھلا
عاشقاں آپ بھلے اپنا دلآرام بھلا

فارسی والوں کی طرح اُردو والے بھی عام طور پر کفر پن اور تعصب کے خلاف اپنا بخار مسجد و بُت خانہ یا دیر و کعبہ پر نکالتے ہیں مثلاً:

کل جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کرکے

اور جب کفر پن سے تنگ آجاتے ہیں تو رندی کے مسلک اور مے خانے کے ماحول کو سراہنے لگتے ہیں۔ میخانے کے شیدائیوں میں ہزاروں اُردو والے ایسے ہیں جنھوں نے کبھی میخانے کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ ہزاروں ایسے ہیں جنھوں نے نہ تو شیشہ و ساغر، نہ ساقی و پیمانہ، نہ مغچہ و پیر مغاں سے نسبت رکھی اور نہ کبھی شراب ناب کا مزا چکھا ہے۔ مگر خدا کو دیکھا نہیں تو عقل سے پہچانا۔ دیر و کعبہ اور مسجد و بُت خانہ کے خلاف میخانہ وہ جگہ ہے جہاں ذات پات، مذہب وملت، رنگ ونسل اور ملک اور علاقے کے فرق مٹ جاتے ہیں۔ ساغر و مینا میں گھل جاتے ہیں اور شراب ناب سے ڈھل جاتے ہیں۔ چاہے کوئی دراصل شراب پیے یا نہ پیے۔ میخانہ دوستی اور ملنساری ایک علامت یا Symbol ہے اور عصبیت اور منافقت کے خلاف ایک علم احتجاج ہے۔ دیکھیے مختلف شعرا نے اسی مضمون میں کیا کیا گل کھلائے ہیں:

کوئی کافر کی طرح کوئی مسلماں کی طرح
لوگ اس دور میں ملتے نہیں انساں کی طرح

کوئی کافر ہمیں سمجھے کہ مسلماں سمجھے
ہم محبت کو تری حاصلِ ایماں سمجھے

ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اور پھر ریاض خیر آبادی کا سیکڑوں اشعار کا نچوڑ یہ ایک شعر کہ:

جنابِ شیخ سے کہہ دو اگر سمجھانے آئے ہیں
کہ ہم دیر و حرم ہوتے ہوئے میخانے آئے ہیں

مذہبی، قومی اور انسانی رواداری کی اس سے بہتر مثال اور کیا مل سکتی ہے کہ اُردو کے ہندو اور مسلمان شعرا، مصنفین اور مترجمین نے ایک دوسرے کے مذہبی عقائد کا احترام کیا اور ایک دوسرے کی آسمانی یا آفاقی کتابوں پر نظمیں لکھیں اور ان کے ترجمے کیے۔ ہندو اور مسلمان شعرا، ادیبوں اور مترجمین نے رامائن، مہابھارت، اپنشد اور بھگوت گیتا کے یا تو ترجمے کیے یا ان کے خیالات کو اپنے ادب میں ضم کیا اگر دوارکا پرشاد افق اور شنکر دیال فرحت نے رامائن کا، طوطا رام شایاں نے مہابھارت کا، جگن ناتھ خوشتر نے بھگوت پُران اور رامائن کا اور رام سہائے تمنا نے بھگوت گیتا کا اُردو میں ترجمہ کیا تو خواجہ دل محمد نے بھی گیتا کا منظوم ترجمہ اسی زبان میں کیا جیسا کہ اس سے پہلے فیضی نے فارسی زبان میں کیا تھا۔ اگر بنواری لعل شعلہ نے برج چھپ لکھی تو خواجہ حسن نظامی نے کرشن بنسری تصنیف کی اور حسرت موہانی نے اپنی غزلوں میں کرشن جی، گوکل متھرا اور برج کے مضامین باندھے۔ نظیر اکبرآبادی نے ہولی اور دیوالی پر اور کرشن جی پر کئی نظمیں کہیں تو اقبال نے رام، رام تیرتھ اور گرونانک پر۔ اسی طرح ہندو شعرا اور ادیبوں نے حمد خدا، نعت رسول اور منقبت پنجتن کو اپنی نظموں کا اہم حصہ بنایا۔ دیکھیے پنڈت دیا شنکر نسیم کی معرکتہ الآرا مثنوی یعنی مثنوی گلزار نسیم، حمد و نعت، منقبت و دعا کے ساتھ کس شان و شوکت کے ساتھ شروع ہوتی ہے:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری

کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمدِ حق و مدحتِ پیمبر

پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنی کہ مطیع پنجتن ہے

یارب مرے خامے کو زباں دے
منقار ہزار داستاں دے

ہر چند اگلے جو اہلِ فن تھے
سلطانِ قلمرو سخن تھے

آگے ان کے فروغ پانا
سورج کو چراغ ہے دکھانا

پر بحر سخن سدا ہے باقی
دریا نہیں کارِ بندِ ساقی

طعنے سے زبان نکتہ چیں روک
رکھ لے مری اہلِ خامہ میں نوک

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے
مرکز پر کشش مری پہنچ جائے

اُردو عوام کی سرپرستی میں ترقی کرتی ہے

کسی بھی زبان کی نشوونما کے لیے کسی نہ کسی سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سرپرستی کبھی شاہی دربار امرا اور خواص سے ملتی ہے تو کبھی عوام سے، اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان کی ہندستان میں رسائی ضرور تھی۔ لکھنؤ اور فیض آباد، رام پور اور بھوپال کے دربار، سلاطین دکن اور خصوصاً نظام حیدرآباد کا دربار اور دلّی میں خاص طور پر بہادر شاہ ظفر کا دربار اُردو زبان کے اہم گہوارے تھے۔ کہیں کہیں بادشاہ بھی شعر کہتے تھے اور چند درباری بھی، غزل گوئی بھی ہوتی تھی اور قصیدہ خوانی بھی۔ قصیدہ کی صنف اگر دربار میں نہ

اُبھرتی تو اور کہاں اُبھرتی۔ استاد ذوق کے قصیدے اپنی آپ نظیر تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں ایک قصیدے کی اُٹھان ملاحظہ ہو:

بعد شاہانِ سلف کے تجھے یوں ہے تفضیل
جیسے قرآن پس توریت و زبور و انجیل

مگر دوسرے درباروں میں بھی قصیدہ خوانی کا کافی عروج ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ قصیدہ خوانی بغیر مبالغہ آمیزی کے نہیں ہو سکتی تھی مگر اس سے قطع نظر الفاظ کی شان و شوکت اور دبدبہ پر قصیدے میں بہت زور ہوا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر مولوی علی حیدر نظم طباطبائی کے قصیدے سے دو بند پیش کرتا ہوں جو نظام حیدرآباد کی تعریف میں کہے گئے تھے، واضح رہے کہ شاعر نے جو کچھ کہا زمانے نے اس کو بالکل اُلٹا کر کے دکھایا۔

ترا ہر حکم محکم بڑھ کے ہو سدِ سکندر سے
جہاں کے خشک و تر پہ تیرا بارانِ کرم برسے
ترے انصاف و عدل و رافت مظلوم پرور سے
فلک کانپے زمیں لرزے جفا سہمے ستم ترسے
دہائی تیری ہو عالم میں اور تو دادگستر ہو
سدا ڈنکا بجے بال ہما کا چتر سر پہ ہو
تجھے اے آصف ساعی ملے اوج سلیمانی
دکن کو تیرے دم سے ہو سدا دعوائے کنعانی
رہے مجرائیوں میں شان فغفوری و خاقانی
درِ دولت پہ تیرے فخر ہو دارا کو دربانی
یہ چوکھٹ سجدہ گاہ تغلق و محمود و سنجر ہو
یہ وہ گھر ہو جہاں آئینہ داروں میں سکندر ہو

مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ اردو کی نشو و نما اور اس کا عروج درباروں کی سرپرستی میں بہت کم ہوا اور عوام کی سرپرستی میں کہیں زیادہ۔ مانا کہیں کہیں کوئی مرزا رفیع سودا یا انشاء اللہ خاں کوئی ذوق یا غالب کوئی داغ یا امیر مینائی درباروں کی سرپرستی میں قصیدے اور غزلیں کہہ لیتے تھے۔ مگر اُردو شعرا کی 95/90 فیصد تعداد دربار سے متعلق نہیں تھی۔ مرزا غالب کی دربار میں رسائی رہی مگر ان کی زیادہ تر غزلیں اور بہترین غزلیں دربار سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھیں۔ جو اشعار غالب کی شاعری کا نچوڑ اور طرۂ امتیاز ہیں۔ وہ دربار کی فضا میں پنپ ہی نہ سکتے تھے۔ مثلاً یہ شعر جس میں غالب نے وصل کو بجائے ایک جسمانی خواہش کے ایک فکر یا Concept بنا کر پیش کیا:

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

یا پھر جب دلّی اُجڑ گئی۔ دربار ختم ہوا لیکن پھر بھی لوگ جھوٹی امیدوں پر جیتے تھے کہ تخت و تاج واپس مل جائے گا تو غالب نے نیم مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

آزادی کے سلب ہو جانے اور انگریزوں کے دلّی پر قبضہ کر لینے کے بعد آزادی کی جو چھوٹی موٹی کوششیں ہو رہی تھیں، ان کی طرف یہ نازک اشارہ ہے:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

عام طور پر اردو کے شعرا اور ادیب دربار سے کم اور فقیری، صوفی منشی اور علم و ہنر سے زیادہ متعلق تھے۔ ان میں سے چند عالم تھے تو علمائے دربار کی صف میں نہیں بلکہ علمائے راسخ کی صف میں آتے تھے۔

تصوف کا اثر

اُردو شاعری پر تصوف کا بڑا گہرا اثر ہے اور امیر خسرو ہی کے وقت سے اونٹ اس کروٹ بیٹھ چکا تھا۔ اس طرح خواص کی بہ نسبت عوام کی سرپرستی کا اُردو شاعری پر بہت زیادہ اثر رہا۔

عام تحریر و تقریر کے علاوہ محفلِ مشاعرہ ایک ایسی زبردست ایجاد تھی کہ اس میں خواص و عوام سب ہی آتے تھے۔ مشاعرہ کوئی Poetry Society نہ تھا جس میں یورپی ملکوں میں صرف خواص کی جگہ ہوتی تھی۔ مشاعرے میں خواص بھی ہوتے تھے مگر ناممکن تھا کہ کسی اچھے یا اوسط درجے کے شاعر کو صرف اس لیے مشاعرے میں جانے سے روکا جائے کہ وہ نادار ہو۔ میر تقی میر جیسے غریب الوطن بھی لکھنؤ کے نوابوں اور رئیسوں کے مشاعرے میں پہنچ گئے۔ شاعر غریب ہو یا امیر ہو، شمع محفل برابر اس کے سامنے آتی تھی اور اچھے شعر پر وہ داد کا برابر مستحق ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشاعروں کے ذریعے سے اچھی زبان کے سننے، بولنے اور لکھنے پر عوام کو بڑی دسترس ہو گئی اور اُردو زبان نے جمہوری شکل اختیار کر لی۔

یہی صورت محرم کی مجلسوں، درگاہوں اور خانقاہوں میں قوالی کی محفلوں کے ذریعے پیدا ہوئی۔ نہ صرف لکھنؤ بلکہ تمام شہروں میں عوام جوق در جوق مجالسِ عزا میں جاتے تھے۔ مثال کے طور پر لکھنؤ میں ایامِ عاشورہ کے دوران انیس و دبیر اور دوسرے اساتذہ اور ذاکرین کو ہزاروں لوگ سن لیتے تھے اور بار بار سنتے تھے۔ مشاعرے سے بھی کہیں زیادہ مجالس میں عوام کی پہنچ تھی اور کسی کو وہاں جانے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ شرکت کے لیے مال و جائیداد کی شرط نہ تھی اور مجلس عزا بھی ایک جمہوری ادارہ بن گئی تھی جس کے ذریعے زبان کی لطافتیں اور نزاکتیں، محاورے، صنائع و بدائع اور اونچے خیالات ہر کس و

تا کس تک پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح عوام کی سرپرستی اُردو کو بڑے پیانے پر ملنے لگی تھی۔ غور فرمایئے کہ جب ہزاروں کی مجلس میں میر انیس نے حسب ذیل بند پڑھا ہوگا اور عوام و خواص سے داد لی ہوگی تو زبان کی ہر دل عزیزی کس درجہ پر پہنچ گئی ہوگی:

ہے کجی عیب مگر حُسن ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
حُسن ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

انیس اور دبیر کے کلام میں جب ایسے معرکے کے بند آتے ہیں تو مجالس اور محفلوں کے ماحول کا خیال کر کے میں اکثر سوچا کرتا ہوں:

ساقی ترا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جس وقت یہ مے تو نے شیشے میں بھری ہوگی

عوامی تحریکیں اور اقدار

رواداری، بے تعصبی اور یکجہتی کی قدروں کو فروغ دینے کے علاوہ کون سی بڑی تحریک ہے جو اردو زبان میں نہ چلی ہو۔ سامراجیت سے ملک کو آزاد کرنے کی تحریک، آزادی حاصل کرنے کے بعد اس کو باقی رکھنے کی تحریک، اس میں سماجی اور معاشی بہتری لانے کی تحریک، سرخ انقلاب کی تحریک، ترقی پسندی کے عنوان کے تحت کئی تحریکیں، مثلاً کسان مزدور تحریک، آزادیِ خیال کی تحریک اور کئی چھوٹی بڑی تحریکیں اس زبان میں مختلف زماں و مکاں میں چلتی رہیں۔ ان دریاؤں کو اگر کوزوں میں بھی بند کیا گیا تو کوزے اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ ان میں سے دریا پھوٹ نکلیں گے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے اور نہ اتنا علم کہ تفصیل میں جا کر بتاؤں کہ زبانِ اردو کا سہارا لے کر ان تحریکوں کے بانیوں اور کرتا دھرتاؤں نے کیا کیا کام کیے۔ مختصر وقت میں صرف چند جھلکیاں ہی پیش کر سکتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ چھوٹی بڑی اقدار کو اٹھانے میں اور تحریکوں کو آگے بڑھانے میں اردو والوں نے کیا کیا کام کیے۔

تحریکِ آزادی میں اردو شعرا اور ادیبوں کا کام اتنا وسیع ہے کہ اس موضوع کو پوری طرح حذف کر دیتا ہوں۔ مگر آزادی کے بعد اس کو باقی رکھنے میں جو جو رخنے پیدا ہو رہے تھے ان کی نشان دہی کرنے اور ان کو بند کرنے کی تلقین کرنے میں اردو والے کبھی پیچھے نہیں رہے۔ جب جب اور جہاں جہاں جمہوریت اور آزادی کی قدروں پر اور آزادیِ خیال و بیان پر ضرب لگنے کا خطرہ پیدا ہوا ہے تو اردو کے ادیبوں اور شعرا نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ مثلاً انور صابری:

میکدے پر بھی سیاست کا اثر چھانے لگا
خلوتِ ساقی میں واعظ بھی نظر آنے لگا
کیا قیامت ہے بنامِ دعوتِ ابرِ بہار
گلستاں کا ذرّہ ذرّہ آگ برسانے لگا
جب زبانِ شوق پر پابندیاں بڑھنے لگیں
وقت خود ناگفتنی افسانہ دُہرانے لگا
دورِ پیمانہ کے بدلے ان دنوں پیرِ مغاں
اہتمامِ گردشِ ایّام فرمانے لگا
تشنگی میں دب کے انور رہ گئی تنقیدِ شعر
نغمہ خواں ہر گیت پر دادِ غزل گانے لگا

ترقی پسند شعرا اور ادیبوں نے مزدور اور کسان کو اس کا حق دلانے، غریبی سے ملکوں کو نکالنے اور تقسیمِ آمدنی و دولت میں مساوات پیدا کرنے کے لیے کیا کیا جدوجہد نہ کی۔ کسی نے انقلاب کا راستہ ڈھونڈا تو کسی نے رفارم کا۔ ان شعرا نے Ideology ہی کو محبوبہ بنالیا اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں کا رتبہ دیا۔ پنگھٹ کی ڈگر بہت کٹھن تھی، مگر نہ ہمت ہاری نہ نا اُمید ہوئے۔ مثلاً فیض:

ہم پر تمھاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے
دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایّام ہی تو ہے

یا یہ کہ:

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
سامانِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیِ ایّام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا
دل ہے تو مداوائے اَلم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

یا یہ کہ:

مخدوم محی الدین نے اپنی نظم رقاصہ کو اس بیت پر ختم کیا ہے:

الٰہی یہ بساطِ رقص اور بھی بسیط ہو
صدائے تیشہ کامراں ہو کوہکن کی جیت ہو

آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ رقاصہ سے کیا مراد ہے۔

مخدوم ترقی پسندی کے ناطے اور کمیونسٹ پارٹی کے اہم رُکن ہونے کے ناطے پنڈت نہرو اور حکومت کی کئی پالیسیوں کے سخت مخالف تھے اور کھل کر تنقید کرتے تھے مگر اردو کے شاعر عثمانیہ یونیورسٹی کے سپوت اور حیدرآباد کے شہری ہونے کے ناطے رواداری کا دامن چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ پنڈت جی کے انتقال پر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور وہ مشہور نظم کہی:

ہزار رنگ ملے اس سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبارِ مشکِ غبار
ہوا ہے وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ شش جہت کا اسیر
نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

مخدوم نے اپنی زندگی کی آخری شام چند دوستوں کے ساتھ گزاری جن میں مجھے بھی شریک ہونے کا فخر تھا۔ رات کے کوئی بارہ بجے محفل کو اس مضمون پر ختم کیا:

دوستو ہاتھ میں ہاتھ دو سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اُٹھائے چلو

اردو اور ہندی کی قربت اور مستقبل

ہر زبان کی کچھ جذباتی یعنی Emotional ضروریات ہوتی ہیں جن کو پورا کیے بغیر زبان پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اس سلسلے میں میں اپنے ذاتی تجربات کا ذکر کرنے کی معافی چاہتے ہوئے دو ایک چیزیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ایک دن مدھیہ پردیش کی روی شنکر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے اور یونیورسٹی کانوکیشن ایڈریس دینے کی فرمائش کی میں نے عرض کیا کہ روی شنکر یونیورسٹی تو ایسے علاقے میں ہے جو ہندی کا گڑھ ہے وہاں شدھ ہندی بولی جاتی ہے اور ایسی ہندی مجھ کو نہیں آتی۔

انھوں نے کہا کہ جو بھاشا آپ بول رہے ہیں وہی ہندی ہے اور لگ بھگ ایسی ہی بھاشا ہم لوگ بھی بولتے ہیں۔ میں نے کہا اگر یہ بات ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے سیدھی سادی ہندستانی میں اپنا ایڈریس تیار کیا۔ فارسی اور عربی کے کوئی دو درجن لفظ نکال کر ان کی جگہ عام فہم اردو ہندی کے لفظ رکھ دیے۔ اردو رسمِ خط میں اس کو لکھا اور ہندی اسٹینوگرافر کو لکھوا دیا۔ اس نے اس کو دیوناگری رسمِ خط میں ٹائپ کیا اور یونیورسٹی نے اس کو چھاپ کر تقسیم کر دیا۔

رائے پور میں میں نے اردو اسکرپٹ میں اپنا ایڈریس پڑھا اور حاضرین نے اپنی نظریں دیوناگری اسکرپٹ پر جمائے رکھیں۔ شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ اس خطبے کو قبولِ عام کی سند ملے۔ چنانچہ دو ہزار آدمیوں نے کان دھر کے سنا اور پسند کیا۔ خطبے کے بعد بڑی تعداد میں پروفیسر اور ودیارتھی مجھ سے ملنے آئے۔ میرا دل بڑھایا اور کہا کہ ایسی بھاشا کو کیوں بڑھاوا نہیں مل رہا ہے جو اپنے آپ ابھر رہی ہے اور جس کو ہر ایک سمجھ سکتا ہے۔ اور سرکار کی طرف سے ایسی بھاشا کا پرچار کیوں ہوتا ہے جس کو صرف زبان کے سوداگر ہی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ میرے دل میں ان سوالوں سے کافی ڈھارس بندھی۔ روی شنکر وشوودیالیہ کے سماجیات کے پروفیسر نے جو ہندی پر پوری طرح قدرت رکھتے ہیں مجھے کچھ پتے کی باتیں بتائیں۔ پہلے تو انھوں نے یہ کہا کہ جیسی بھاشا ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے سماچار یا سرکاری تقریروں میں بولی جارہی ہے یا سرکاری فائلوں میں لکھی جارہی ہے وہ Communication یا لین دین کی بھاشا نہیں ہے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ اس بھاشا سے لوگوں کی جذباتی ضروریات پوری نہیں ہو رہی تھیں، ماں اپنے بچے کو کس زبان میں لوری دے؟ باپ اپنے بیٹے کو کس بھاشا میں نصیحت کرے؟ عاشق اپنی محبوبہ سے کس زبان میں بات کرے؟ روزمرّہ کے بازاری اور گھریلو کاروبار میں کس زبان سے

کام لیا جائے؟ چونکہ سرکاری زبان سے ان معاملات میں بالکل کام نہیں نپٹا اس لیے ضرورت تھی کہ دوبارہ ایسی زبان میں بولنے کو ملے جس سے یہ نازک کام نکل سکیں۔ چنانچہ اردو موقع واردات پر موجود تھی۔ اس لیے بہت سے الفاظ محاورے، اصطلاحات اور طرزِ بیان ہندی نے دوبارہ اردو سے لینا شروع کر دیا ہے۔

پروفیسر مذکور نے پھر مجھ سے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ اردو غزل دوبارہ عود کر آئی ہے اور ہندی والوں نے بھی اردو کی بحریں وصنائع و بدائع اور الفاظ محاورے وغیرہ استعمال کرنے شروع کر دیے ہیں۔ سو بات کی ایک بات انھوں نے یہ بتائی کہ اس سرکاری بھاشا کو ہندستانی عورتیں نہیں اپنا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ اتری بھارت میں ہندو عورتیں بھی اس کو نہیں بول رہی ہیں۔

اصل نکتہ یہ ہے کہ جب گھروں میں مائیں اور بہنیں کسی زبان کو نہیں بولتیں تو بچے بھی اس زبان کو نہیں اپناتے۔ پانچ چھ سال کی عمر تک جو انسان کی عمر کا سب سے زیادہ اثر پذیر حصہ ہے۔ اگر کوئی بھاشا ذہنوں میں نہ بیٹھ جائے اور بعد کے زمانے میں اس کو لاگو کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ مانا کہ چھ سال کی عمر کے بعد اسکولوں اور کالجوں میں اس بھاشا کو بولا اور رائج کیا جاسکتا ہے پر وہ بات نہیں آسکتی جو ماں کی گود میں پلنے اور گھروں اور کنبوں میں بڑھتے وقت زبان کو سننے اور بولنے سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گلی کوچوں میں بازاروں میں اور دفتروں میں بڑی حد تک لوگ وہی بول رہے ہیں جو گھروں میں مائیں بولتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کے پرچار میں سرکاری مشکل پسندوں کی طرف سے جو انوسٹمنٹ ہو رہا ہے اس کا منافع یعنی ریٹ آف ریٹرن بہت کم ہے۔

اردو غزل کا دوبارہ ابھار جو ہندستان میں تیس سال کے بعد اب پھر شروع ہوا ہے وہ ایک طرف تو اردو اور ہندی کی قربت پر دلالت کرتا ہے تو دوسری طرف ایک اہم جذباتی ضرورت کو پورا کرتا ہے چونکہ پیڑھی در پیڑھی کی فصل تیس چالیس سال میں پیدا ہو چکی ہے، اس لیے جب غزل دوبارہ منظرِ عام پر آتی ہے تو اپنی ثقہ شکل میں نہیں بلکہ سیدھی سادی Elementary شکل میں آتی ہے۔ بیگم اختر، اقبال بانو، مہدی حسن، فریدہ خانم اور عابدہ پروین کی گائی ہوئی غزلیں معیاری غزلیں ہوتی تھیں۔ لیکن ہندستان میں فی الحال اردو غزل کچھ تو معیاری اور کچھ غیر معیاری معمولی گیت نما ہے۔ گانے والے کبھی کبھی بحر و قافیہ کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ یقین ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ثقہ پن دوبارہ واپس آئے گا۔ غزل اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر حاوی ہونے لگے گی اور دونوں کو پاس لانے میں مددگار ہوگی۔

غزل چونکہ حُسن و عشق، وفا و جفا اور رنگ و بو اور ذوق و جمال سے عبارت ہے اور دراصل Lyric ہے اس لیے اس کو گانا بھی انھی راگوں کی سرپرستی میں چاہیے یعنی تغزل والے یا شرنگار رس کے راگ ہیں۔ مثلاً یمن جے جونتی باگیشوری راگیشوری بہار تلک کا مود دیس کھماج وغیرہ لیکن بہت سے موسیقار اس کو گمبھیر Austere راگوں میں گا کر اس کے اثر کو کم کر دیتے ہیں۔ مثلاً پوریا مارواتوڑی مالکوس بھیرو وغیرہ۔

ٹیکنکل اصطلاحات کو چھوڑ کر اردو اور ہندی کی نزدیکی اور میل ملاپ Convergence کے اس چوتھے دور میں اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اردو اور ہندی فلم میں کوئی فرق رہ نہیں گیا ہے اس کے علاوہ آکاش وانی اور دوردرشن کے وہ ڈرامے جو بڑی تعداد میں لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے لگے ہیں۔ ان کو چاہے ہندی ڈرامے کہہ لیجیے یا اردو ڈرامے۔ اگر پہلے سے کسی فلم یا ڈرامے کے بارے میں پہلے سے بتا نہ دیا جائے کہ یہ ہندی ہے یا اردو تو سننے اور دیکھنے والے اپنی مرضی سے کبھی ہندی کہہ لیں گے اور کبھی اردو۔ اردو اور ہندی خبروں کے بعد جن کو ایک خاص زبان میں پڑھنے کے لیے لوگوں کو تنخواہ یا فیس دی جاتی ہے۔ جب ہم خاندان، نکڑ، رجنی، کرم چند، بنیاد وغیرہ ڈرامے یا پروگرام دیکھتے ہیں تو دونوں زبانوں کی بنیادی یکسانی پر اچنبھا ہونے لگتا ہے۔ اس حقیقت کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگر کسی دوست ساتھی یا دور ہی کے جاننے والے سے آپ کی مڈبھیڑ دلی، لکھنؤ، حیدرآباد، ممبئی، بھوپال، سری نگر یا چنڈی گڑھ میں ہو جائے اور کھڑے کھڑے آپ ان سے 15 منٹ باتیں کرلیں، اس طرح کہ ان باتوں میں مکمل ترسیل یعنی Communication ہوتی رہے اور پھر کوئی آپ دونوں سے پوچھے کہ آپ کون سی زبان بول رہے تھے تو یہ بالکل ممکن ہے کہ آپ کہیں ہندی اور آپ کے دوست کہیں کہ وہ اردو بول رہے تھے۔ اردو اور ہندی کے اس نئے تال میل کو دیکھتے ہوئے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے:

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

□□□

مخمور سعیدی

آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت — دلّی میں

آزادی کے بعد اردو زبان اپنی جنم بھومی ہندستان میں بڑے نامساعد حالات سے دوچار رہی۔ عملی زندگی سے اسے خارج کردینے کی منصوبہ بند کوششیں کی گئیں اور سرکاری درس گاہوں میں اس کی تعلیم کا نظم بھی بتدریج ختم کردینے کے جتن کیے گئے بالخصوص شمالی ہندستان میں جو اردو کا گھر تھا۔ اس صورتِ حال کے منفی اثرات سے چشم پوشی نامناسب ہوگی لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ تردید سچائی ہے کہ اس زبان کو فنا کردینے کی تمام تر کوششیں بڑی حد تک ناکام رہی ہیں۔

اردو دشمنوں کی ناکامی کا بڑا سبب اس زبان کی عوامی مقبولیت ہے اور اسے عوام رس بنانے میں اس کے ادب وصحافت کا اہم حصہ رہا ہے۔ تقسیم کے وقت اردو کے ادبی رسائل کی ملک بھر میں دھوم تھی۔ ان مشہور رسائل میں دلی سے نکلنے والا ایک اہم رسالہ ماہنامہ ''ساقی'' تھا جس کے مالک و مدیر ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے شاہد احمد دہلوی تھے۔ لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ رسالہ اپنے مالک و مدیر کے ساتھ ترکِ وطن کرکے کراچی منتقل ہوگیا تھا۔

آزادی کے بعد جن رسائل و جرائد نے دلی کی ادبی صحافت کو نئی زندگی دی ان میں سے چند کا تعارف و تذکرہ یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

ماہنامہ ''شاہراہ'' محمد یوسف جامعی نے آزادی کے فوراً بعد جاری کیا تھا۔ مکتبہ شاہراہ کے نام سے انھوں نے ایک اشاعت گھر بھی قائم کیا تھا جو اردو بازار کے ایک بالا خانے میں تھا۔ وہیں سے رسالہ بھی نکلتا تھا۔ یہ رسالہ ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ یکے بعد دیگرے کئی مشہور ترقی پسند اس کے مدیر رہے۔ ان میں پرکاش پنڈت، مخمور جالندھری، واحق جونپوری اور ظ۔ انصاری کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ میں جب 1953 میں دلی آیا تو تین چار مہینے میں نے ایک ریستوران میں کاؤنٹر کلرک کی ملازمت کی۔ یہ ریستوران جس کے مالک افضل پشاوری خود بھی شاعر تھے، اردو بازار میں ''شاہراہ'' کے دفتر کے قریب ہی تھا اور اس میں کام کرنے والوں کو افضل صاحب کی طرف سے ہدایت تھی کہ اگر کسی گاہک کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ قلم کار برادری سے تعلق رکھتا ہے تو اس سے خاص احترام سے پیش آیا جائے، چنانچہ وہاں آنے والوں میں اکثریت ادیبوں اور شاعروں کی ہوتی تھی۔ مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ اور بھی کئی ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کو پہلی بار میں نے اسی ریستوران میں دیکھا۔

آزادی کے بعد دلی سے نکلنے والے رسالوں میں ''شاہراہ'' غالباً پہلا رسالہ تھا جسے اس وقت کے بیشتر اہم لکھنے والوں کا قلمی تعاون حاصل ہوا۔ ظ۔ انصاری اپنے زمانۂ ادارت میں اسے آفسٹ پر چھپوانے لگے تھے۔ 1954 میں دلی میں ترقی پسندوں کی جو کل ہند کانفرنس ہوئی تھی، اس کے بعد اس کے صفحات پر فراق گورکھپوری اور علی سردار جعفری میں ایک گرما گرم مباحثہ بھی ہوا تھا۔ علی سردار جعفری ترقی پسند نظریۂ ادب کے مستند شارحین میں تھے جس کی رو سے ادب کو سیاست کی انگلی پکڑ کر چلنا تھا۔ فراق صاحب خود کو ترقی پسندوں میں گنتے تھے لیکن ترقی پسندی کی تعریف ان کے ذہن میں وہ نہیں تھی جو ادب کے ترقی پسند نظریہ سازوں کی طرف سے پیش کی جاتی تھی۔ فراق صاحب ادب کے جمالیاتی پہلو کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ بحث زوردار ہوئی لیکن فراق صاحب اپنی بات منوانے میں ناکام رہے۔ ان سبھی قلمکاروں نے جو ترقی پسندی کے دعویدار تھے، جعفری صاحب کے موقف کی تائید کی — رسالے کے مالک محمد یوسف صاحب جامعی کو ان نظریاتی مباحث سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ کاروباری آدمی تھے، ان کے لیے ''شاہراہ'' کی اہمیت اگر کچھ تھی تو بس اتنی کہ یہ ان کے مکتبے سے چھپنے والی کتابوں کی تشہیر کا ایک وسیلہ تھا۔ گوپال مِتّل ترقی پسندوں کی مخالفت پر کمربستہ ہوئے تو ''شاہراہ'' میں ہنس راج رہبر، علی سردار جعفری اور کئی دوسرے ترقی پسندوں نے مِتّل صاحب کو بہت برا بھلا کہا، مِتّل صاحب نے بھی اپنے رسالے ''تحریک'' میں ان کے ترکی بہ ترکی جواب دیے لیکن مِتّل صاحب کے ساتھ جامعی صاحب کے جو دوستانہ مراسم تھے، ان میں دونوں طرف سے کوئی فرق نہ آیا۔ کچھ مدت بعد جب محمد یوسف جامعی صاحب نے کتابوں کی بجائے مچھلیوں کا تھوک کاروبار شروع کیا جو زیادہ منافع بخش تھا تو ''شاہراہ'' اور مکتبہ شاہراہ دونوں سے ان کی دلچسپی کم ہوگئی۔ پہلے ''شاہراہ'' بند ہوا پھر مکتبہ شاہراہ۔ لیکن پچاس کی دہائی میں ''شاہراہ'' ایک اہم ادبی رسالے کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔

مشہور صحافی، ادیب اور شاعر گوپال مِتّل، جن کا آبائی شہر مالیر کوٹلہ تھا، آزادی کے بعد لاہور سے دلی آئے تھے۔ یہیں سے انھوں نے 1949 میں

"تحریک" کا اجرا کیا لیکن تب اس کا ایک ہی شمارہ نکل سکا۔ 1953 میں انھوں نے یہ رسالہ دوبارہ جاری کیا۔ اس بار ادارۂ تحریر میں ان کے علاوہ کرشن اثر، وشواناتھ درد، من موہن تلخ اور راجیندر ر دیپک کے نام تھے جو سب کے سب تازہ واردانِ بساطِ ادب میں تھے۔ راجیندر ر دیپک آگے چل کر باقی کے نام سے مشہور ہوئے۔ دو تین شماروں کے بعد یہ نام ادارۂ تحریر میں شامل نہیں رہے لیکن ان کی تخلیقات "تحریک" میں شائع ہوتی رہیں۔ چھٹے شمارے سے اس رسالے کے ساتھ میری وابستگی ہوئی۔ میں ابھی دلی میں نووارد تھا۔ متل صاحب نے ایک محفل میں مجھے سنا، جو نظم میں نے سنائی وہ انھیں پسند آئی۔ کچھ دن بعد انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کرلی۔ آگے چل کر مشہور ادیب تمکین کاظمی، جن کا قیام حیدرآباد میں تھا، اور متل صاحب کے بڑے بیٹے پریم گوپال متل کے نام بھی سرورق پر چھپنے لگے۔ تمکین کاظمی صاحب اپنی وفات تک اس رسالے سے وابستہ رہے اور میں تقریباً 25 سال تک جب 1978 میں یہ رسالہ بند ہوا۔

گوپال متل اپنے قیام لاہور کے زمانے میں تاجور نجیب آبادی کے رسالے "شاہکار" کے شریک مدیر رہے تھے اور بعض دوسرے رسائل سے بھی ان کی وابستگی رہی تھی۔ "تحریک" کو اس کے ابتدائی شماروں ہی سے کئی ممتاز اور معتبر ادیبوں اور شاعروں کا قلمی تعاون حاصل ہوگیا تھا جن میں پاکستانی بھی تھے لیکن ترقی پسندوں کی طرف سے اسے پُرزور مخالفت کا بھی سامنا ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ رسالہ ادب اور سیاست دونوں میں آزاد خیالی کا نقیب تھا اور نہ صرف ترقی پسند نظریۂ ادب کو سختی سے رد کرتا تھا بلکہ اشتراکیت کا بھی مخالف تھا۔ 1960 کے آس پاس لکھنے والوں کی جو نئی نسل سامنے آئی ان میں سے اکثر کی ادبی سرگرمی کا آغاز اسی رسالے سے ہوا تھا۔ ترقی پسندی کے رد اور جدیدیت کے فروغ میں "تحریک" نے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر جو اہم کردار ادا کیا ہے، اس کا خاطرخواہ اعتراف ابھی نہیں ہوا ہے۔ اس نے کئی ایسے تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی شائع کیے جن سے بعض مسلمات کی تردید اور نئے حقائق کی دریافت ہوئی۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو پر اس میں رشید حسن خاں نے جو اعتراضات کیے تھے، ان کا وزن محسوس کرتے ہوئے یونیورسٹی کو یہ کتاب واپس لینی پڑگئی تھی۔

"تحریک" کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے جن میں غالب نمبر، جگر نمبر، بسمل سعیدی نمبر، بیس سالہ نمبر اور سلور جبلی نمبر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ غالب نمبر میں جو غالب صدی کے موقع پر شائع ہوا تھا، پہلی بار غالب کی مشہور فارسی کتاب "دستنبو" کا اردو ترجمہ چھپا تھا جو راقم السطور نے کیا تھا۔ بیس سالہ نمبر میں نظم ونثر کے اس ذخیرے کا انتخاب پیش کیا گیا تھا جو اس مدت میں اس کی فائلوں میں جمع ہوگیا تھا اور سلور جبلی نمبر میں آزادی کے بعد مختلف صوبائی زبانوں میں تخلیق ہونے والے شعری اور نثری ادب پر تعارفی مضامین اور اس کا انتخاب شامل تھا — اس رسالے کا ایک خاص کالم "مانگے کا اجالا" کے عنوان سے تھا۔ اس کالم میں دوسرے ادبی جرائد میں شائع ہونے والے اہم مضامین کے خلاصے پیش کیے جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایسی شعری تخلیقات بھی اس کالم میں جگہ پاتی تھیں جو ندرت اور تازگی کا احساس جگانے والی ہوں۔ یہ چیزیں زیادہ تر، ہندستان میں آسانی سے دستیاب نہ ہونے والے پاکستانی جرائد سے لی جاتی تھیں۔ "تحریک" اپنے قارئین کے ایسے خطوط بھی جن میں کوئی بحث اٹھائی گئی ہو یا جو رسالے میں چھپنے والی تحریروں کی خوبیوں یا خامیوں پر محاکمہ کرتے ہوں "بزمِ احباب" کے زیرِ عنوان شائع کرتا تھا۔ اس وقت تک یہ روش آج کی طرح عام نہ تھی۔ — "تحریک" کا دفتر دریا گنج میں تھا جو دفتری اوقات ختم ہونے کے بعد اکثر و بیشتر نئے لکھنے والوں کی نشست گاہ بن جایا کرتا تھا۔

"فنکار"، "شاہراہ" کے سابق ایڈیٹر پرکاش پنڈت کا ذاتی رسالہ تھا جو انھوں نے بڑی دھوم دھام سے نکالا تھا لیکن اس کے دو یا تین شمارے ہی نکلے۔ یہ اُس قضیے کی وجہ سے یاد رکھا جائے گا جو اس کے صفحات پر نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی اور فراق گورکھپوری کے درمیان چھڑا اور بعد میں جس نے خاصا طول پکڑا۔ اس کے پس منظر میں اثر صاحب کی طرف سے فراق صاحب کے کلام میں زبان و بیان کی بعض غلطیوں کی نشاندہی تھی۔ "فنکار" کے پہلے ہی شمارے میں فراق صاحب کی ایک غزل چھپی، اس کا مقطع تھا:

فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس وقت
اثر بیٹھے کیا کرتے ہیں ہی ہی

ظاہر ہے اس پھبتی پر اثر صاحب کو مشتعل ہونا ہی تھا۔ انھوں نے اسی زمین میں ایک طویل غزل لکھی جس کے بیشتر اشعار فراق صاحب کی ہجو میں تھے۔ ان کی یہ غزل "فنکار" کے دوسرے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس کا آخری شعر تھا:

بہت کچھ اور کہہ سکتا ہوں لیکن
جوابِ جاہلاں باشد خموشی

اثر صاحب کے اشعار کا لہجہ بہت سخت تھا لیکن انھوں نے غزل بھیجتے ہوئے پرکاش پنڈت کو جو خط لکھا اس میں اپنے لہجے کی اس درشتی کے حق میں ان کی دلیل یہ تھی کہ: کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔ پرکاش پنڈت ان

اشعار کی اشاعت میں متامل تھے۔ انھوں نے اپنے اس تامل کا اظہار ادارتی نوٹ میں کیا اور یہ وضاحت بھی کی کہ یہ اشعار اثر صاحب کے اصرار پر شائع کیے جارہے ہیں۔ اشعار کے ساتھ اثر صاحب کا خط چھاپ کر بھی انھوں نے اپنی برأت ظاہر کردی تھی۔ ''فنکار'' کا دفتر جامع مسجد کے علاقے میں ''شاہراہ'' کے دفتر کے قریب ہی قائم کیا گیا تھا۔

آغا شاعر دہلوی کے ایک شاگرد تھے دگمبر پرشاد گوہر دہلوی۔ وہ اور ان کے چھوٹے بھائی بمل پرشاد جین آغا شاعر کے بہت ارادت مند تھے۔ بمل پرشاد شاعر یا نثار تو نہیں تھے لیکن اردو بہت اچھی جانتے تھے۔ دونوں بھائی جواہرات کا کاروبار کرتے تھے اور دونوں دریبہ کلاں میں ایک ہی دکان پر بیٹھتے تھے جو موروثی تھی۔ اردو سے ان کے شغف کا ایک ثبوت ماہنامہ ''شعلہ وشبنم'' تھا۔ دکان کی طرح اس میں بھی دونوں بھائی برابر کے حصے دار تھے۔ میں نے بھی اس رسالے کے لیے دو مہینے کام کیا اور ان دو مہینوں کی تنخواہ کے طور پر گوہر صاحب سے، جو رسالے کے مالی امور کے نگراں تھے، مجھے بہ مشکل بیس روپے ملے ہوں گے۔ یہ رقم اس زمانے میں بھی، جب جامع مسجد کے آس پاس کے سستے ریستورانوں میں چار چھ آنے میں ایک وقت کا کھانا کھایا جاسکتا تھا، دو مہینے کی کفالت کی ضامن نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن میں نے ان دو مہینوں میں اپنی جیب سے صرف شام کا کھانا ہی کھایا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت گوہر صاحب مجھے ساتھ لے کر چاندنی چوک کے ایک اچھے ریستوران میں جا بیٹھتے جو لکشمی ریسٹورنٹ کے نام سے مشہور تھا اور ان کی دکان کے قریب ہی واقع تھا۔ ریستوران کا ایک کیبن شاید ان کے لیے ریزرو تھا کیونکہ ہم جب بھی وہاں گئے وہ کیبن خالی ملا۔ کیبن میں بیٹھ کر گوہر صاحب کھانے پینے کی چیزوں کا خاصا بڑا آرڈر دیتے اور جب تک یہ چیزیں میز پر آتیں وہ اپنی نئی کہی ہوئی دو تین غزلیں مجھے سنادیتے۔ غزلیں سنتے ہوئے جب کسی شعر پر میں داد دیتا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ پھر ہم دونوں مل کر ان چیزوں پر ہاتھ صاف کرتے جو اس دوران میں بیرا میز پر سجا جاتا۔

''شعلہ وشبنم'' کو اس دور کے کئی بڑے لکھنے والوں کا قلمی تعاون حاصل تھا جن میں اثر لکھنوی، جوش ملیح آبادی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، بشیشور پرشاد منور لکھنوی، بسمل سعیدی، گوپی ناتھ امن کی تخلیقات اکثر اس کے صفحات پر نظر آتیں۔ جوش صاحب اور امن صاحب کبھی ایک دوسرے کے قریب رہے تھے مگر پھر جوش صاحب کی رندی و سرمستی اور امن صاحب کی ان مشاغل سے بیزاری نے دونوں کے درمیان بڑی تلخیاں پیدا کردیں۔ ایک تلخ واقعے کو بنیاد بنا کر جوش صاحب نے امن صاحب کے خلاف بڑی سخت نظم کہی۔ وہ نظم جو اپنے کسی مجموعے میں بھی جوش صاحب نے شامل کی ہے، اولاً ''شعلہ وشبنم'' ہی میں چھپی، پھر نظم پر امن صاحب کا ردِعمل بھی۔ ''شعلہ وشبنم'' سے میری مختصر سی وابستگی کے دنوں میں بھی ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ سحر عشق آبادی جو ایک مستند عروض داں تھے، انھوں نے کتابت کو اپنی گزر بسر کا وسیلہ بنایا تھا اور ''شعلہ وشبنم'' کی کتابت وہی کرتے تھے۔ گوہر صاحب ان دنوں اپنے استاد کی یاد میں اپنے رسالے کا خاص نمبر نکالنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ نمبر کے لیے سحر صاحب جو مضامین کتابت کرکے لائے، ان میں سے ایک مضمون میں آغا شاعر صاحب کے بعض لکھنوی معاصرین سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے، ان کی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مضمون کس کا تھا یہ تو اب یاد نہیں لیکن جب یہ پروف ریڈنگ کے لیے میرے پاس آیا تو کتابت شدہ مضمون کا اصل مضمون سے مقابلہ کرتے ہوئے میں حیران رہ گیا۔ مضمون نگار نے بعض لکھنوی معاصرین سے آغا شاعر کو برتر ٹھہرایا تھا لیکن سحر صاحب نے مضمون میں تحریف کرکے ہر جگہ لکھنوی شعرا کی برتری اپنے طور پر ثابت کردی تھی۔ اگلے روز جب سحر صاحب تشریف لائے اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا تو سحر صاحب نے جواب دیا: مضمون نگار نے غلط بیانی کی تھی اور میں اپنے قلم سے کوئی غلط بات نہیں لکھ سکتا۔ دراصل سحر صاحب عزیز لکھنوی کے شاگرد تھے اور اس نسبت سے یہ بات ان کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی کہ کوئی دہلوی شاعر اپنے ہمعصر لکھنوی شعرا کو نیچا دکھا آئے۔

1960 سے 70 تک کی درمیانی مدت میں دلّی سے کئی ادبی رسالے نکلے اور بند ہوئے۔ وشواناتھ درد نے یکے بعد دیگرے ''نورجہاں'' اور ''تلاش'' کے نام سے دو رسالے نکالے۔ ''نورجہاں'' کا دفتر ہمدرد دواخانے کے نزدیک لال کنویں کے علاقے میں تھا اور ''تلاش'' انھوں نے قرولباغ سے جاری کیا تھا۔ ان میں ''تلاش'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ سریندر پرکاش، جنھیں بعد میں جدید افسانہ نگاروں میں امتیاز حاصل ہوا، ان کے ایک دو ابتدائی افسانے اسی رسالے میں شائع ہوئے۔ ''تلاش'' نے اپنے قلمکاروں کا ایک حلقہ بھی قائم کرنے کی کوشش کی تھی جس کی نشستیں اس کے دفتر میں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ویسے یہ رسالہ کسی خاص مسلک کا پیرو نہ تھا۔ اس میں روایت پسند، ترقی پسند، جدیدیت پسند سبھی ادبی رویوں کے حامل قلمکاروں کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں۔

نریندر تھجل ایک مقامی کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے لیکن اردو زبان اور اس کے ادب سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ راج نرائن راز ان کے قریبی دوستوں میں تھے چنانچہ انھوں نے ان کے تعاون سے ایک رسالہ ''محور'' کے

نام سے نکالا۔ نریندر نشچل قرولباغ میں رہتے تھے اور ان کی قیامگاہ ہی رسالے کا دفتر تھی۔ صاف ستھرا رسالہ تھا مگر باقاعدگی سے کبھی نہیں نکلا اور پھر بند ہوگیا۔ دت بھارتی مقبولِ عام ناول لکھنے کے لیے شہرت رکھتے تھے اور ان کے ایک ناول نے جو "چوٹ" کے نام سے شائع ہوا تھا، غیر معمولی مقبولیت حاصل کی تھی۔ اردو کا بازار مندا پڑا تو ہندی میں لکھنے لگے اگرچہ ہندی سے زیادہ واقف نہیں تھے۔ ان کے اردو میں لکھے ہوئے مسودوں کو کوئی دوسرا ہندی میں منتقل کرتا۔ خیر، انھیں باگی نے ادبی صحافت میں قدم رکھنے پر آمادہ کیا اور دت صاحب نے ان کے تعاون سے ماہنامہ "تخلیق" کا اجرا کیا۔ رسالے میں دت صاحب کا ایک ناول بھی قسط وار شائع ہونا شروع ہوا لیکن اس میں چھپنے والی زیادہ تر چیزوں پر جدیدیت کی چھاپ ہوتی تھی کیونکہ عملاً اس کے ایڈیٹر باگی ہی تھے، دت صاحب کی ذمے داری مالی وسائل کی فراہمی تھی۔ چند شماروں کے بعد جب اس فراہمی میں دت صاحب کو تامّل ہوا تو رسالے کی اشاعت بند ہوگئی۔ اس کی ایک خصوصی اشاعت "مختصر نظم نمبر" کی بڑی شہرت ہوئی تھی اس زمانے میں۔

مشہور محقق مالک رام صاحب نے بھی، جب وہ فارن سروس سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوکر دلی آئے تو ایک رسالہ "تحریر" کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ تحقیقی نوعیت کا رسالہ تھا اور اس کی ترتیب و تدوین میں ظلِ عباس عباسی ان کے معاون تھے۔ یہ وہی ظلِ عباس عباسی ہیں جنھوں نے "کلیاتِ میر" کی تدوینِ نو کی تھی اور جسے بنیاد بنا کر اب جناب شمس الرحمان فاروقی کی نگرانی میں احمد محفوظ صاحب نے اردو کونسل کے لیے "کلیاتِ میر" مرتب کی ہے۔ "تحریر" کی اشاعت میں باقاعدگی نہیں تھی، سال میں اس کے دو تین شمارے ہی نکلتے لیکن ہر شمارہ اہم تحریروں کا حامل ہوتا— اسی زمانے میں ہرنرائن کوہلی نے "گہوارہ" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ نکالا تھا۔ کوہلی صاحب کاروباری آدمی تھے مگر ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ یہ رسالہ اسی دلچسپی کا ثمرہ تھا مگر اس کے دو تین شمارے ہی نکلے۔ اس کے مشیروں میں بزرگ شاعر ساحر ہوشیارپوری اور نوجوان شاعر امیر قزلباش شامل تھے۔ کوہلی صاحب قرولباغ میں طبیہ کالج کے احاطے میں رہتے تھے۔ رسالے کا دفتر بھی وہی تھا۔

ایک ماہانہ رسالہ "سوبرس" کے نام سے مودود صدیقی صاحب نے اپنے کچھ واقف کاروں کے تعاون سے نکالا تھا۔ اس کا دفتر باڑا ہندو راؤ میں تھا۔ ایڈیٹر نشتر خانقاہی تھے جنھوں نے تھوڑے تھوڑے وقفے کے لیے "شاہراہ" اور "بیسویں صدی" میں بھی کام کیا تھا۔ "بیسویں صدی" کے ادارے سے مودود صدیقی بھی وابستہ رہ چکے تھے اور وہاں مودود صاحب چونکہ انتظامی امور دیکھتے تھے اس لیے بجا طور پر امید کی جاسکتی تھی کہ ان کا یہ تجربہ "سوبرس" کو لمبی زندگی دینے میں معاون ہوگا لیکن مذکورہ بالا بعض رسائل کی طرح اس کے بھی چند ہی شمارے نکل سکے۔

لکھنؤ سے نکلنے والا "نگار" اردو کے موقر ترین ادبی رسائل میں تھا جس کے مالک و مدیر نیاز فتحپوری تھے۔ جب نیاز صاحب ترکِ وطن کرکے کراچی چلے گئے تو کچھ لوگوں نے جن میں اکبر علی خاں عرشی زادہ پیش پیش تھے اسے نیاز صاحب کے ورثے کے طور پر یہاں زندہ رکھنا چاہا۔ اس کے کچھ شمارے انھوں نے رامپور سے اسی نہج پر نکالے جس نہج پر لکھنؤ سے نیاز صاحب نکالتے تھے مگر مولوی مدن کی سی بات پیدا نہ ہوسکی۔ پھر اسے انھوں نے دلی میں مقیم اپنے ایک قریبی رشتے دار کلب علی خاں مہمند کے حوالے کردیا۔ میں ان دنوں بیکار تھا۔ عرشی زادہ نے جو میرے اچھے دوستوں میں تھے، مجھ سے خود تو نہیں کہا لیکن مودود صدیقی صاحب سے کہلوایا کہ اس کی ادارت میں سنبھال لوں۔ چنانچہ یہ ایک برس تک میری ادارت میں نکلا۔ میں نے اس کا گیٹ اپ بھی بدل دیا اور مشمولات کی نوعیت بھی۔ دو چار مہینے میں اس کی تعداد اشاعت تین ہزار تک پہنچ گئی لیکن کوئی نجی رسالہ محض تعداد اشاعت کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتا جب تک اسے اچھے اشتہارات نہ ملیں اور اردو رسائل کو اشتہار اب مشکل ہی سے ملتے ہیں۔ آخر ایک سال بعد جب محض تعداد اشاعت کی بنیاد پر اس کے اخراجات پورے ہوتے نظر نہ آئے اور اشتہارات کے حصول کی بھی کوئی سبیل پیدا نہ ہوئی تو کلب علی خاں صاحب نے مجھ سے مشورہ کرکے اس کی اشاعت موقوف کردی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی دلی شاخ نے بھی انھی دنوں ایک رسالہ "صبح" کے نام سے نکالا تھا۔ اس کی مدیرہ انجمن کی دہلی شاخ کی سکریٹری بیگم حمیدہ سلطان تھیں۔ بہار برنی جو ایک تجربہ کار صحافی تھے، ان کے معاون تھے لیکن اس کے تو دو تین ہی شمارے نکل سکے۔

تقسیم کے بعد لاہور سے دلی آکر بسنے والے ادیبوں اور شاعروں میں بھیم سین ظفر ادیب بھی تھے جو احسان دانش کے شاگرد رہے تھے۔ مسکین قسم کے آدمی تھے، پاکستان میں کافی جائداد چھوڑ کر آئے تھے لیکن یہاں اس کا مناسب معاوضہ حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ ان کی رہائش باڑا ہندوراؤ میں تھی لیکن دفتر کٹرہ نظام الملک، اردو بازار میں تھا جہاں سے انھوں نے ایک رسالہ "ماحول" کے نام سے نکالا تھا جو ترقی پسندوں کا ہمنوا تھا لیکن ترقی پسندوں نے اسے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کبھی کبھار ہی نکلتا تھا۔ بعد میں جب ظفر ادیب صاحب کی مالی حالت زیادہ کمزور ہوگئی تو

یہ کبھی کبھار کی اشاعت بھی موقوف ہوگئی۔

دلّی کے قدیم علمی ادبی ماہناموں میں جو آج بھی نکل رہے ہیں ''برہان''، ''جامعہ''، ''منادی'' اور ''دین دنیا'' کا ذکر ضروری ہے۔ ان رسالوں کے ایڈیٹر بدلتے رہے ہیں لیکن ان کا مقصدِ اشاعت ایک ہی رہا ہے۔ علم و ادب کی سنجیدہ روایت کی توسیع اور استحکام۔ ''برہان'' ندوۃ المصنفین کا نقیب ہے اور اس کے بانی ایڈیٹر مفتی عتیق الرحمان عثمانی تھے۔ ''جامعہ'' جامعہ ملیہ اسلامیہ کا علمی ترجمان ہے۔ ''برہان'' کے برعکس جس کو ماضی کے علمی خزانوں، بالخصوص اسلامی علوم وفنون کے خزانوں کی بازیافت سے زیادہ دلچسپی رہی ہے، ''جامعہ'' عصری علوم سے زیادہ سروکار رکھتا ہے۔ آج کل اس کے مدیر پروفیسر شمیم حنفی ہیں جو اپنے رفقائے کار کے ساتھ بڑے انہماک سے اس کی ترتیب و تدوین کا فریضہ انجام دیتے ہیں اس کا اجرا جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے دو سال بعد 1923 میں ہوا تھا۔ 1947 سے 1960 تک کی درمیانی مدت میں حالات کی نامساعدت کی وجہ سے اس کی اشاعت موقوف رہی، 1960 میں یہ دوبارہ نکلنا شروع ہوا اور تب سے برابر نکل رہا ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر فرزانہ خلیل نے اس کا تنقیدی اشاریہ مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

''دین دنیا'' عوامی مزاج کے تقاضوں کو زیادہ ملحوظ رکھنے والا رسالہ ہے۔ اس کے بانی مدیر مفتی شوکت علی فہمی تھے جن کے ذہن و ذوق کی تربیت میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کا بڑا دخل رہا تھا۔ مرحوم عزیز حسن بقائی کے رسالے ''پیشوا'' کا بھی یہیں ذکر ہونا چاہیے۔ بقائی صاحب کو بھی خواجہ صاحب سے قربت رہی تھی۔ ''پیشوا'' ان کی زندگی میں باقاعدگی سے نکلتا رہا مگر ان کے انتقال کے بعد اس کی اشاعت موقوف ہوگئی، انھوں نے کچھ اور رسالے بھی وقتاً فوقتاً نکالے جن میں ایک کے گالی نمبر کی بڑی دھوم مچی تھی۔ مگر یہ خاص خاص ہاتھوں تک ہی پہنچ سکا تھا۔ اس میں ایڈیٹر کی طبع زاد سینکڑوں گالیاں درج تھیں اور ہر گالی ندرت کی حامل تھی۔ ''منادی'' بھی اسی زمانے کا رسالہ ہے۔ اس کا اجرا شمس العلما خواجہ حسن نظامی نے ہفت روزہ جریدے کی صورت میں کیا تھا۔ اس میں خواجہ صاحب کے شب و روز کے کوائف کے علاوہ ملک کی سیاسی، سماجی اور مذہبی صورتِ حال پر تبصرے بھی ہوتے تھے۔ اب یہ ماہنامے کی شکل میں ان کے جانشین خواجہ حسن ثانی نظامی شائع کر رہے ہیں۔ مزاج میں علمیت اور تصوف کی وہی آمیزش ہے جسے اس خانوادے کی خصوصیت کہا جاسکتا ہے اور اس کے قارئین کا اب بھی ایک وسیع حلقہ ہے۔

ماہنامہ ''کتاب نما'' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی طرف سے شائع ہوتا ہے اور اس کے بانی ایڈیٹر مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں ہیں۔ اس کا شمار موجودہ دور کے اچھے ادبی رسائل میں ہے۔ اس نے اردو کی ادبی صحافت میں ایک نئی روایت کا آغاز بھی کیا ہے۔ اس کے ہر شمارے میں کسی اہم ادیب، شاعر یا صحافی کا لکھا ہوا ''مہمان اداریہ'' شائع ہوتا ہے اور اس طرح مختلف موضوعات و مسائل پر جو عصری ادبی اور علمی صورتِ حال کے کسی نہ کسی اہم پہلو سے تعلق رکھتے ہیں، مختلف نقاطِ نظر سامنے آتے رہتے ہیں۔ اب اس نے ایک نیا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ یہ ہے ان ادیبوں اور شاعروں پر تعارفی مضامین کا سلسلہ جو اردو کی روایتی بستیوں سے دور، بیرونی ممالک میں اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ (جاری)

بدھ کی کہانیاں

مصنف: اجیتا کھنہ

بودھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر بے حد زور دیا اور ہر ذی روح کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا۔ کہانیوں کی یہ کتاب گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات سے ترتیب دی گئی ہے۔

صفحات: 80 قیمت: -/65 روپے

تینالی رمن کی کہانیاں

مصنف: سی ایل ایل جیاپروا، مترجم: نامی انصاری

شمالی ہند میں جس طرح بیربل کی حاضر جوابی اور ذہانت کی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح جنوبی ہند میں تینالی رمن کی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ظرافت، عقل مندی، رحم دلی اور خوش تدبیری کے باعث وجے نگر کے راجا کرشن دیو رائے کا درباری شاعر بن گیا تھا اور کئی موقعوں پر اس نے راجا کی مشکلیں آسان کیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی کچھ دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 72، قیمت: -/60 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

علی احمد فاطمی

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اکثر معاملات میں ماضی کے عرفان کے بغیر مستقبل کے امکان پر باتیں کر پانا ممکن نہیں ہوا کرتا لیکن اردو زبان کے مسائل ہوں یا تعلیم و تدریس کے مسائل اکثر ان پر باتیں کرتے ہوئے ہم ماضی کی طرف زیادہ ہی چلے جاتے ہیں اور حال کا صرف رونا دھونا کرتے ہیں، پورے طور پر حال کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرتے جبکہ عقلمندی اور ہوش مندی یہ کہتی ہے کہ ماضی کے صرف روشن پہلو ہی ہمارے کام کے ہوتے ہیں جس سے ہم مستقبل کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ تاریخ اور تجربہ بتاتے ہیں کہ کئی صدیوں میں اردو زبان و ثقافت کا جو کینڈا اور خاکہ تیار ہوا ہے وہ ہندستان کی رنگارنگی اور عوامی و سماجی بوقلمونی کا ایک ایسا مظہر ہے جس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس سرزمین پر نشو ونما کا کوئی چراغ تنہا روشن نہیں ہو سکتا۔ یہ بات کل بھی سچ تھی اور آج یہ سچائی کچھ زیادہ ہی واضح روپ اختیار کر چکی ہے۔

اس تہذیبی و ثقافتی پس منظر کی ایک روشن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان الگ تھلگ رہ کر ترقی نہیں کر سکتی۔ وہ صرف شعر و سخن کے ذریعے عوام اور سماج میں اندر تک پھیل نہیں سکتی جب تک عوامی ضرورتوں سے اس کا گہرا رشتہ نہ ہو آج ان ضرورتوں اور صورتوں میں کچھ زیادہ ہی شدت آ چکی ہے۔ آج اسے روز بروز پھیلتی اور بڑھتی ہوئی سائنسی اور اقتصادی ترقیوں پر نہ صرف گہری نظر رکھنی ہوگی بلکہ اس کے ساتھ مل کر رچ بس کر انفارمیشن، مواصلات، نقل و حمل، ٹیکنالوجی وغیرہ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہوگا تبھی ہم نہ صرف شعر و ادب میں ہونے والی تبدیلیوں کو قریب سے محسوس کریں گے بلکہ دنیا میں پھیلتی ہوئی عالم کاری کی پرتوں اور جہتوں کو بھی سمجھ سکیں گے اور اردو کو عالمگیر رشتوں سے بھی جوڑ سکیں گے۔ ہمیں خاموشی اور علاحدگی کی نہیں انضمام و امتزاج کی پالیسی اختیار کرنی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ عالمگیریت کے مواقع ہیں تو خطرات بھی ہوں گے اور سب سے بڑا خطرہ زبان و ادب کی تہذیبی شناخت اور جداگانہ کردار کا ہو سکتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ہم اس سے آنکھیں چار کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ ایسی صورت حال میں اردو کے بڑے بڑے دانشوروں، اداروں کو سامنے آنا ہوگا اور درمیان سے ایسے راستے نکالنے ہوں گے کہ ہم اپنے تہذیبی سرمایے سے یکسر محروم بھی نہ ہو جائیں اور ترقی کی نئی راہوں سے الگ اور دور بھی نہ ہونے پائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ترقی کی نئی صورتوں اور راہوں سے واقف ہوں لیکن یہاں بھی ایک مشکل یہ ہے کہ اکثر اردو والے اردو زبان کا مطلب اردو ادب تصور کرتے ہیں اور ادب میں معیار زبان، معیار تہذیب، معاملات قلب و جگر، حادثات ہجر و وصال میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بزرگوں کو ہمہ وقت اردو کے گرتے ہوئے معیار، بگڑتی ہوئی زبان کی فکر ہے جو غلط تو نہیں ہے لیکن وہ یہ سوچنے کو تیار نہیں ہیں کہ جو زبان بگڑ رہی ہے ہو سکتا ہے کہ اس تخریبی عمل میں تعمیر کی کوئی شکل پوشیدہ ہو۔ سوال یہ بھی تو ہے کہ بزرگ لوگ ان نئی صورتوں سے کس قدر واقف ہیں جن سے آج کے عہد کا بچہ بچہ واقف ہو چلا ہے۔ اردو کے دانشوران، شعرا و ادبا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر الہ آباد میں جتنے بھی اردو کے اساتذہ ہیں، ان میں دو ایک کو چھوڑ کر کسی کے پاس کمپیوٹر نہیں ہے وہ اردو سافٹ ویئر سے واقف نہیں۔ وہ ابھی تک فنِ کتابت کے زوال اور اس کے ختم ہو جانے کے آزار میں مبتلا ہیں انھیں ای میل اور ویب سائٹ کا کوئی اندازہ نہیں ہے جبکہ آج کی نئی نسل خواہ وہ کسی زبان اور قوم کی ہو کمپیوٹر کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ آج کا ترقی یافتہ طالب علم ان سب کے ذریعے پوری دنیا سے نہ صرف باخبر ہے بلکہ اپنے رشتے بناتا رہتا ہے۔

ایک ادیب ہونے کے ناطے میں یہ بھی اعتراف کرتا چلوں کہ ان تمام نئی صورتوں کی وجہ سے ادبی و تہذیبی سطح پر کچھ نقصانات بھی ہو رہے ہیں مثلاً کتب بینی اور خط نویسی کا کلچر ختم ہوتا جا رہا ہے۔ جب بے شمار نئی چیزوں کی آمد ہوگی تو کچھ پرانی چیزیں رخصت تو ہوں گی ہی، یہ قانونِ فطرت ہے۔ تاہم اسے بچانے کی صورتوں پر بھی غور کرتے چلنا ہے لیکن اس سے زیادہ یہ ضروری ہے کہ ان نئی صورتوں نے قوم، ملت، سماج اور معاشرت کے لیے کیا بہتر صورتیں پیدا کی ہیں اور ہمارے تعلیمی نظام میں ایک نئی جان کس طرح پڑ رہی ہے اور نئی نسل کے لیے روزگار کے وسائل کیسے اور کس طرح قائم ہو رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارا نوجوان دنیا کے نوجوانوں سے کس طرح آنکھیں ملا پا رہا ہے ـــ ایسے میں جب ہماری اردو تعلیم کی طرف نظر جاتی ہے تو اکثر مایوسی ہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اگر ہم الہ آباد میں ہی اردو تعلیم کی صورت حال پر غور کریں تو اندازہ

ہوگا کہ سیکڑوں برس جے ابتدائی تعلیم کے اقلیتی ادارے ہوں یا اعلا تعلیم سے وابستہ شعبہ ہائے اردو۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ان میں سے بیشتر ادارے آج بھی پرانے نظام و نصاب میں سانسیں لے رہے ہیں، اردو سیکھنے سکھانے کی پرانی کتابیں، قواعد کی کتابیں، نظم و نثر کے نصابات، مرثیہ، قصیدہ وغیرہ کے اقتباسات، خیر یہ سب بھی ضروری ہے لیکن ان میں کہیں بھی نہ ترجے کا نصاب ہے، نہ اطلاعات کا نہ صحافت کا اور نہ کمپیوٹر اور دیگر تکنیکی تعلیم کا۔ پھر ان اداروں سے نکلنے والا نوجوان آج کے ترقی یافتہ سماج کی تبدیلیوں سے اپنے آپ کو کس قدر ہم آہنگ کر سکے گا؟ آج کی زندگی کی سمت و رفتار کا کس قدر ساتھ دے سکے گا؟ یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے جو اردو والوں بالخصوص اساتذہ اور دانشوران کو سوچنا اور سمجھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پچھڑی اور پیچیدہ صورتوں میں ایک نئی سوچ، نئی اپروچ اور نئی حکمت عملی کی شدید ضرورت ہے۔ اردو زبان کو سماجیات اور معاشیات سے جوڑنے کی ضرورت ہے اور یہی وہ موڑ ہے جہاں ہم اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا یہ بیان ملاحظہ کرتے چلیں:

''اردو تعلیم اور فروغ زبان میں اگر کسی چیز کی کمی رہی تو وہ منصوبہ بند پالیسی سازی کی۔ پچاس سال کے بعد تہذیب، تشخص اور قومیت کی نئی تفہیم ہو رہی ہے۔ یہ تفہیم ماضی سے جڑنے کی بھی ہے، اپنی جڑوں کی بازیافت کی بھی ہے اور تاریخ کے Distortions کو سمجھنے سے بھی عبارت ہے۔ اکیسویں صدی میں اس بازیافت کے بغیر سوچا بھی نہیں جا سکتا اور نہ کسی پالیسی کی ہیئت ترکیبی متعین کی جا سکتی ہے۔''

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے وہ سماجی، لسانی اور تہذیبی اعتبار سے پایۂ استناد کو پہنچی ہوئی زبان ہے ایسی زبان کے بارے میں مشہور ماہر لسانیات فِش مین نے بڑے اچھے اشارے کیے تھے— ''زبان محض تبادلۂ خیال کا ذریعہ نہیں، نہ ہی مختلف خیالات، احساسات، نظریات کی خواہ پوشیدہ ہوں یا واضح ترجمان ہوتی ہے بلکہ زبان خود ایک مکمل مواد کی حیثیت رکھتی ہے، باقاعدہ طور پر سماج کی عکاس ہوتی ہے اور عوام کی معاشرتی حیثیت اور تعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ زبان کے ذریعے مختلف حالات و موضوعات اور سماجی اقدار ظاہر ہوتی ہیں۔''

اردو زبان میں بے پناہ خوبیاں ہیں۔ اس نے ایک طرف جمالیاتی طور پر متاثر کیا تو دوسری طرف سماجی اور معاشرتی طور پر بھی اپنا کردار قائم کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جس زبان میں مقبولیت اور انجذابیت کا ایسا مادہ ہو وہ ترقی اور تبدیلی کی تمام راہوں اور مشکلوں کو بہ آسانی طے کر سکتی ہے۔ اردو ایسا کرتی بھی رہی ہے لیکن معیار پرست ادیبوں اور ناقدوں نے اس طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی— کچھ اور لوگ جن کا تعلق سماجیات، معاشیات وغیرہ سے تھا وہ نہایت خاموشی سے اردو کا رشتہ جدید علوم و فنون سے جوڑنے کی بے لوث اور مفید خدمات انجام دیتے رہے لیکن دونوں ہی صورتوں میں کسی بڑی پالیسی یا حکمت عملی کا منصوبہ پھر بھی نہ بن سکا اس لیے بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ اردو ذریعۂ تعلیم و ترسیل، روزگار اور پیشے کے طور پر اس کا استعمال، انتظامیہ اور اعلانیہ وغیرہ میں اس کا استعمال ایک منصوبہ بند طریقے سے نہ ہو سکا اور مشکلات کھڑی ہوتی گئیں۔ 1975 میں گجرال کمیٹی کی تشکیل ضرور ہوئی لیکن اوّل تو اس پر عمل درآمد کتنا ہوا یہ تو قابلِ غور ہے ہی، پھر یہ بھی کہ یہ کمیٹی بھی آج کی تازہ ترین صورتوں سے کس قدر ہم آہنگ ہے اپنے آپ میں ایک سوال ہے۔

سماجیات اور معاشیات پر اردو میں جتنے بھی کام ہوئے ہیں وہ تسلی بخش نہیں ہیں نیز ان کے انتظام و انصرام اس نوع کا ہے کہ ان کی دستیابی و فراہمی بھی ایک مسئلہ بنی رہتی ہے۔ اب یہ کام NCPUL اور NCERT اور بعض دوسرے سرکاری یا نیم سرکاری ادارے کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ان کی بھی مشکلیں ہیں کہ ان کے پاس واقف کاروں، عالموں اور ترجمہ کرنے والوں کی کمی ہے۔ ایسے تربیت یافتہ مصنفین اور مترجمین کا فقدان ہے جو ان کاموں کو بڑے پیمانے پر کرنے کا بیڑا اٹھا سکیں۔ ہر چند کہ یہ ادارے طوفان میں دیا روشن کر رہے ہیں لیکن اس سے زیادہ ضروری ہے کہ آج کے تعلیمی ادارے، نیز اقلیتی ادارے بطور خاص اپنے نصاب، کورسیز کو از سر نو مرتب کریں اور اس میں ترجمہ، میڈیا اور دوسرے تکنیکی نصابات کو جوڑیں اور عصری تعلیم سے آراستہ اور پیراستہ کر کے ایک نئی شکل و صورت عطا کریں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ کچھ رضا کار تنظیمیں بھی اس طرف توجہ دیں اور قدیم روایات و رسمیات سے بالاتر ہو کر جدید تعلیمات کے حوالے سے اپنے آپ کو اور اس سے زیادہ نوجوانوں کو تیار کریں۔ لیکن یہاں ایک مشکل یہ آ کھڑی ہوتی ہے کہ اردو سماج یا بہ حالات موجودہ مسلم سماج کی بگڑی ہوئی تعلیمی صورتِ حال خود انھیں ان جدید صورتوں سے بیگانہ کیے ہوئے ہے۔ اساتذہ کی بھی کوئی تربیت نہیں ہے وہ پوری زندگی ایک ہی طرز کی تعلیم، طریقۂ تعلیم، نصاب اور انداز پر ختم کر دیتے ہیں اس سے آگے بڑھنا اور اپنے آپ کو بدلنا نہیں چاہتے۔ سماجی سطح پر بھی صورتِ حال اس قدر بگڑ چکی ہے کہ شادی گھر تو کھل رہے ہیں لیکن کتب خانوں وغیرہ کا کلچر ختم سا ہو گیا ہے ایسے میں حکومت اور اداروں کی ذمے داری زیادہ بڑھ جاتی ہے اور حکومتوں کا زبان، تہذیب، ثقافت وغیرہ کے

دفاع اور محافظت کے سلسلے میں جو رول ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم اتنا عرض کروں گا کہ بقول محمد حمید اللہ بھٹ 1956 کے Reorgainsation of Indian States کے ایکٹ کے بعد ریاستی حکومتوں کو ریاستی زبانوں کے فروغ کا حق دیا گیا لیکن اقلیتی زبان کا فروغ پہلی ترجیح پھر بھی نہ بن سکا۔ اردو یہاں بھی کسی صوبے کی باقاعدہ سرکاری زبان نہ ہونے کی وجہ سے عدم توجہ کا شکار ہوگئی۔ اس لیے یہ بات دہرائی جاتی رہی کہ اردو داں طبقے کو فروغ دینے کے لیے خود اپنی طاقت لگانے کی شدید ضرورت ہے لیکن صورت حال تو اس کے برعکس ہی رہی۔ اپنی ان مایوسیوں اور ناکامیوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے بقول فیض۔ ''روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں۔''

میں یہاں سبحان آصف نام کے ایک ایسے نوجوان کے تاثرات پیش کرنا چاہتا ہوں جو سنبھل کے گاؤں سے تعلق رکھتا ہے جس کے والد کسان اور والدہ کم پڑھی لکھی گھریلو عورت ہیں۔ ابتدائی تعلیم مدرسے میں حاصل کی اس کے بعد مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اسلامک اسٹڈیز سے ایم.اے. کیا اور پھر قومی اردو کونسل کے قائم کردہ کمپیوٹر سینٹر سے ڈپلوما حاصل کیا، اب اس کے چند جملے ملاحظے کیجیے:

''دیکھا جائے تو کمپیوٹر اس زمانے کی ضرورت ہے، ایک ایسی ضرورت جس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس کے بغیر ہم کوئی کام مکمل طور پر انجام دے سکتے ہیں۔

''اس سے اردو والے عصر حاضر کے تقاضوں پر کھرے اتر سکتے ہیں اور یہی چیزیں کسی بھی شخص کو روزگار دلانے میں معاون ہوتی ہیں۔ اب یہ بات ہمارے اوپر منحصر ہے کہ ہم اپنے اندر کتنا کمال پیدا کرتے ہیں۔

''اس علم کے ذریعے ہم اپنے آپ کو احساسِ کمتری سے بالاتر محسوس کررہے ہیں۔ خود اعتمادی اور خود انحصاری دونوں مستحکم ہوتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ ہر موڑ پر ہم اپنے اندر بدلاؤ پارہے ہیں ساتھ ہی ساتھ یہ احساس ہماری خود اعتمادی میں بھی اضافہ کررہا ہے کہ ہم بھی اس انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اس مقام پر کوئی ملٹی لنگول ہی پہنچ سکتا ہے۔''

(اردو دنیا، فروری 2004، ص-59)

آخری جملہ معنی خیز ہے اور یہ بھی طرح طرح کے حصول علم کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اب آپ صرف اردو یا عربی فارسی پڑھ کر دور تک نہیں جاسکتے آپ کو دوسری زبانیں اور دوسرے علوم بھی جاننے ہوں گے اپنی ذات کے دائرے سے نکل کر حیات و کائنات کی طرف دیکھنا ہوگا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اکیسویں صدی انسانی ترقی کی ایک عظیم صدی ہے اور جس رفتار سے تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں آگے کیا ہوجائے گا کچھ کہا نہیں جاسکتا، عقل حیران ہے اور ٹھہرا ہوا ذہن پریشان — ایسی صورت میں نئی نسل کو اب خود سوچنا اور اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ مسائل ہیں اور مشکلات بھی، لیکن اگر آپ سبحان آصف جیسا جذبہ رکھتے ہیں، کڑی محنت اور باخبری پر یقین رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ذہن ہموار اور راستہ خوشگوار نہ ہو۔ بے رحم تقاضوں اور بعض اداروں کی مسلسل و مبارک کوششوں سے یہ تو ہوا کہ اس بے خبر اور پس ماندہ علاقے میں بھی:

''روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں''

Dept. of Urdu, University of Allahabad, Allahabad

□□□

اردو ادب کی ساجیاتی تاریخ

پروفیسر محمد حسن

ادبی ساجیات ایک نئے علم کی حیثیت سے حال ہی میں سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب اردو میں ادبی ساجیات کے مطالعے کی پہلی کوشش ہے جو اس کے تمام اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

پہلی اشاعت

334 صفحات، قیمت: 98.00 روپے

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

مصنف برسوں تک آل انڈیا ریڈیو میں ذمے دارانہ عہدوں پر رہے ہیں، انھوں نے باریک بینی کے ساتھ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان پر گفتگو کی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے قلم کاروں کے لیے یہ کتاب خصوصی افادیت رکھتی ہے۔

پہلی اشاعت

646 صفحات، قیمت: 200.00 روپے

مرتب: پروفیسر محمد حسن

1947ء سے 1990 تک اردو میں لکھے جانے والے ڈراموں کا ایک نمائندہ انتخاب جن میں تاریخی، نیم تاریخی، سماجی اور سراسر تخیلی ڈرامے بھی شامل ہیں۔ ابتدا میں فاضل مرتب نے ڈرامے کے فن اور اس کی روایت پر بھرپور گفتگو کی ہے۔

پہلی اشاعت

600 صفحات، قیمت: 156.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مظفر حسین

ڈھائی ہزار زبانوں کے وجود پر خطرہ

یہ قانونِ فطرت ہے کہ جو چیزیں استعمال میں نہیں آتی ہیں، وہ رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتی ہیں۔ بعض استثنٰی کو چھوڑ کر یہ ضابطہ بہت حد تک صحیح ہے۔

انسان کے اظہارِ خیال کا سب سے طاقتور وسیلہ زبان ہے۔ اگر زبان کا استعمال ہی نہیں ہوگا تو اس پر بھی یہی ضابطہ نافذ ہوگا۔ انسان کی پیدا کردہ چیزوں کو بچانے کے لیے آدمی شروع سے ہی کوشاں رہا ہے۔ اس لیے کوئی زبان، خواہ وہ وقت کے ساتھ مر چکی ہو، ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا ہے۔ ہمارے ملک میں دیکھا جائے تو آزادی سے قبل سنسکرت کا استعمال بہت کم ہوگیا تھا، لیکن جوں ہی اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی، وہ پھر سے چلن میں آگئی۔ انسان نے اپنے تمدن میں متعدد زبانوں کو جنم دیا، اس لیے دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جہاں کوئی زبان وجود میں نہ ہو۔ خواہ رسم خط ہو نہ ہو، بولی تو ہوگی ہی۔

پچھلے دنوں مشہور ماہرِ لسانیات اینڈریو ڈیلی کی ایک تصنیف جب بازار میں آئی تو اس نے لوگوں کو چونکا دیا۔ اینڈریو کی اس کتاب کا نام ہے Language in Danger۔ اس کتاب میں انسانی تمدن کے ساتھ الگ الگ وقتوں میں وجود میں آئی زبانوں کی مفصل جانکاری دی گئی ہے۔ دنیا میں اظہارِ خیال کے سب سے طاقتور وسیلے، زبان کی ترقی و تنزل کی کہانی دلچسپ حقائق کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اینڈریو لکھتے ہیں کہ دنیا کی ترقی کی کہانی تو زبانوں کے توسط سے معلوم کی جاسکتی ہے، لیکن زبان کے پیدا ہونے اور مرنے کی کہانی اسے خود ہی بتانی پڑتی ہے، تو کتنا عجیب لگتا ہے! سیاست ہو یا سائنس، اس کے اظہار کے لیے کوئی طاقتور وسیلہ ہونا پہلی شرط ہے۔ فن مصوری، موسیقی اور رقص یہ تمام اظہار کے وسیلے ہوسکتے ہیں، لیکن انھیں بھی پہلی ضرورت حرف علت و حرف صحیح کی ہی پڑتی ہے۔ انگریزی میں لکھی گئی اس کتاب کے مصنف کا کہنا ہے کہ ''دنیا میں الگ الگ اسباب سے کچھ زبانوں کی بالادستی قائم ہوتی جارہی ہے'' اس لیے دیگر زبانوں کا استعمال نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان میں پڑھنے اور لکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ زبان سمٹ کر تاریکی میں چلی جاتی ہے۔ اپنی زبان کو بچانا اس لیے لازمی ہے، کیونکہ دوسری زبانوں میں ہم کتنی ہی مہارت حاصل کرلیں، وہ ہماری تہذیب و تمدن کی محافظت نہیں کرسکتیں۔ خودی کی بنیادی حیثیت کو برقرار رکھنا ہے تو آپ کو اپنی زبان سیکھنی اور پڑھنی ہی ہوگی۔

مصنف کا یہ تجزیہ ہے کہ اکیسویں صدی ختم ہوتے ہوتے قریب پچیس سو زبانیں دم توڑ دیں گی۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اس معاملے میں زبانوں کا سب سے بڑا دشمن گلوبلائزیشن کا عمل ہے۔ ''ساری دنیا ایک ہوجائے'' یہ تصور صرف ایک زبان کو زندہ رکھنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ جب زبان ایک ہوگی، تو اسی کا نظریہ اور اسی کی تہذیب اس خطے پر مسلط کردی جائے گی۔ یعنی آج کی طرح نہ تو الگ الگ مذاہب ہوں گے اور نہ ہی فلسفے۔ پوری دنیا ایک جیسے تیوہار اور ایک جیسے رسم و رواج کی غلام ہوجائے گی۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طاقت نہ صرف اپنی زبان دوسروں پر زور زبردستی سے تھوپے، بلکہ اس خطے کی تہذیب، اس کے مذہب اور اس کی سوچ کی بھی اس طرح سے تذلیل کرے کہ وہ پھر سے سر نہ اٹھا سکے۔

آج ہمیں جس گلوبلائزیشن کی سیکھ دی جارہی ہے، وہ صرف دنیا میں سازوسامان کے تبادلے تک ہی محدود نہیں رہنے والی ہے، بلکہ اس گلوبلائزیشن کے نام پر دنیا کی دوسری زبانوں کی پہچان کو بھی ختم کردیا گیا ہے۔ بڑی طاقتیں اس تشہیر میں لگی ہوئی ہیں کہ چھوٹی زبانوں کی بجائے بڑی زبانوں کا استعمال کریں۔ یعنی آبادی کی بنیاد پر جو زبان زیادہ بولی جاتی ہے اور جس کا دخل سائنس، تکنیک، مراسلات، آمدورفت اور تجارت میں ہے، اسی کا استعمال کیا جائے۔ اس لیے پیچھے کے دروازے سے یہ بڑی طاقتیں انگریزی کو پھر سے پوری دنیا کی زبان بنانے کے تئیں پابندِ عہد ہیں۔

1991 میں انٹرہائی ٹیک پولیٹیکل کانفرنس میں روس جیسے ملک کے نمائندے، جو ہر جگہ اپنی زبان کا استعمال کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا، ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے ہوئے نظر آئے۔

اس وقت دنیا میں ایک ارب، آٹھ کروڑ لوگ انگریزی کا استعمال کررہے ہیں۔ انگریزی کے حامی سائنس اور گلوبلائزیشن کے نام پر ساری دنیا

کو انگریزی کے رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں۔ انگریزی سلطنت جہاں جہاں گئی، اپنی زبان ساتھ لے کر گئی۔ اس نے اپنی زبان کو اتنی عزت دی کہ ان کی نوآبادیات میں رہنے والا ہر شخص انگریزی پڑھنے اور سیکھنے کے لیے پاگل ہوگیا۔ اسے لگنے لگا کہ انگریزی ترقی اور عزت دلانے والی کنجی ہے۔ اس لیے وہ ممالک، جو انگریزی کے ماتحت تھے، وہاں انگریزی اور غیر انگریزی حامی دو طبقے واضح طور پر نظر آنے لگے۔ قومیت کے نعرے سے جب یہ آزاد ہوکر اپنا الگ وجود بنانے کی کوشش کرنے لگے تو اب سیاست کی جگہ معیشت کو ترجیح دینا شروع کیا گیا، جس کا آگے چل کر خوبصورت نام ''گلوبلائزیشن'' رکھ دیا گیا۔

مالک کی زبان جب محکوم عوام بولنے لگتے ہیں تب عوام کی خودداری خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سکندر نے جن ممالک کو فتح کرلیا، وہاں یونانی زبان چل پڑی۔ اسی طرح لیٹن زبان دنیا کے ایک بڑے خطے میں پہنچ گئی۔ جب رعایا غیر ملکی راجہ کی زبان بولنے لگتی ہے، تب اس ملک کی اپنی زبان اور ثقافت کی تنزلی فطری بات ہے۔ ہندستان کو ہی دیکھیں۔ عرب اپنی زبان عربی لے کر آئے، مغلوں کی زبان فارسی تھی، اس لیے سرکاری کام کاج کی زبان جب فارسی بن گئی تو ہندستانی زبانوں کی تنزلی شروع ہوگئی۔ ان کی زبان آتے ہی ان کی ثقافت سر چڑھ کر بولنے لگی۔

امریکہ سوپر پاور بن کر اپنی زبان ساری دنیا پر لادنا چاہتا ہے، اس لیے گلوبلائزیشن کے نام پر انگریزی کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ امریکی فوج اور ان کے افسران جس ملک میں پہنچتے ہیں، اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے علم بردار بن کر دیگر ملکوں پر اسے مسلط کر دیتے ہیں۔ سعودی عرب کے باشندے وہاں امریکی فوج کو اس لیے پسند نہیں کرتے کیونکہ امریکی فوجی سعودی عرب کی زبان اور ثقافت کو چوٹ پہنچاتے ہیں۔ عربی نوجوان ان سے جو سیکھتے ہیں، اس سے ان کے ملک میں ثقافتی ٹکراؤ کا خطرہ بڑھتا جاتا ہے۔ اپنی دھرتی اور اپنی تاریخ و جغرافیہ کو بچانے کے لیے وہ اپنے یہاں سے امریکی فوجیوں کو جلد سے جلد روانہ کردینا چاہتے ہیں۔

انگریزی زبان کو امریکی میڈیا اور ملٹی نیشنل کمپنیاں پوری دنیا میں پھیلانے کی کوشش کررہی ہیں۔ دونوں ہتھیار اچوک ہیں۔ اس سے دیگر ممالک کی زبانیں اور وہاں کا کاروبار خطرے میں پڑ رہا ہے۔ سودیشی کے جذبے کو ٹھیس پہنچتی ہے اور بدیشی چیزیں ہی نہیں، بلکہ بدیشی سوچ، بدیشی جذبہ اور بدیشی مال ان کے یہاں انگریزی کی بالادستی قائم کرنے میں کامیاب ہورہا ہے۔

اس خطرے کو چین، جاپان اور یورپ کے بعض ممالک نے بخوبی سمجھ لیا ہے، اس لیے وہ اپنی زبان کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ڈالر کو پٹخنے کے لیے یورو کو اپنانے والے ممالک انگریزی سے پرہیز کررہے ہیں۔ عراق پر حملے کو لے کر جب فرانس اور جرمنی امریکہ کی حمایت میں نہیں گئے تو امریکہ نے ان کے مال کا بائیکاٹ کیا۔ فرانس نے اس کے ردعمل میں اپنی فرنچ زبان میں سے ان الفاظ کو نکال دیا جو انگریزی سے لیے گئے تھے۔

یورپ کے بعض ممالک اپنی زبانوں کے تئیں کافی بیدار ہیں، اس لیے وہ انگریزی کو اپنے یہاں نہیں آنے دینا چاہتے۔ ہمارے یہاں جو یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی کے بغیر ترقی نہیں ہوتی، اسے ان ممالک نے جھٹلا کر دکھا دیا ہے کہ ہماری مادری زبان ہی ہمیں زیادہ علم، افتخار اور عزت نفس دے سکتی ہے۔

آئین ہند کی آٹھویں فہرست میں چار زبانوں کو شامل کرنے کی بات پر راجیہ سبھا میں کافی تنازعہ ہوا۔ اس تنازعے کے بیچ سابق نائب وزیر اعظم، لال کرشن آڈوانی نے اعلان کیا کہ کچھ اہم زبانیں چھوٹ گئی ہیں، ان کے لیے جلد ہی آئین میں ترمیم کی جائے گی۔ ایوان میں دو گھنٹے کی بحث کے بعد بوڈو، سنتھالی، ڈوگری اور میتھلی زبان کو آئین کی آٹھویں فہرست میں شامل کرنے سے متعلق ترمیم کو صفر کے مقابلے 151 ووٹوں سے منظور کرلیا گیا۔ پارلیمنٹ کی یہ بیداری یقیناً زبانوں کے اس تاریک عہد میں امید کی ایک کرن ہے۔

(بشکریہ ''اردو نامہ''، پٹنہ، 6 جون 2004)

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلا درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت نادار کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، ونگ-6، نئی دہلی-110066

عبیدالرحمٰن

مریخ پر زندگی؟

مریخ زمانۂ قدیم سے انسانی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ماہرین فلکیات اور دیگر سائنس دانوں کے علاوہ جیوتشیوں اور نجومیوں نے بھی اس سیارے میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس حوالے سے اپنا تجسس برقرار رکھا ہے۔ مریخ ''مارس'' سرخ سیارہ یا منگل گرہ ایک ہی سیارے کے مختلف نام ہیں۔ جیوتشیوں کے نزدیک یہ سیارہ بڑی عجیب خصوصیات کا حامل ہے اور زمین پر انسانی زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، لہٰذا عوام الناس میں یہ سیارہ کہیں نحوست، غضب و غصہ، فتنہ و فساد اور جنگ و جدال کی نشانی ہے تو کہیں یہ خوش حالی، خوش بختی اور ترقی کا ضامن۔ ان حضرات کے مطابق مریخ کو ایک دوسرا سیارہ مشتری (Jupiter) کنٹرول کرتا ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص کے زائچہ یا کنڈلی میں صرف منگل ہے تو وہ اس کے لیے اچھا نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ اگر جوپیٹر یا برہسپتی گرہ بھی ہے تو پھر یہ کنڈلی مبارک بن جاتی ہے۔ غرض یہ کہ جیوتشیوں کے نزدیک یہ ایک اہم سیارہ ہے جس کے انسانی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کبھی یہ اثرات منفی نوعیت کے ہوتے ہیں تو کبھی مثبت۔ ماہرین فلکیات اور خلائی سائنس دانوں کے نزدیک یہ باتیں کمزور ہیں اور انھیں سائنس کا اعتبار حاصل نہیں ہے۔

ہماری زمین اور مریخ

مریخ نظام شمسی کا ایک ایسا سیارہ ہے جس کا مشاہدہ دوربین سے ممکن ہے۔ اس کے علاوہ صرف ایک اور سیارہ عطارد (Mercury) کا جائزہ دوربین سے لیا جاسکتا ہے۔ اگر سورج سے دوری اختیار کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے تو مریخ کا نمبر چوتھا ہے جو ہماری زمین کے بعد واقع ہوا ہے یعنی یہ زمین کا ہم سایہ ہے۔ اسی لیے ان دونوں کی فضا، طبعی اور کیمیائی ساخت اور ان کے ماحول میں بہت کچھ مشترک ہے۔

سترھویں صدی میں جب مغرب میں سب سے پہلے گلیلیو نے اپنی دوربین سے اس سیارہ کا جائزہ لیا تو یہ اسے ایک سرخ طشت کی طرح نظر آیا لہٰذا اس کا نام مارس (Mars) تجویز کیا جو دراصل رومیوں کے جنگ و جدال کے دیوتا کا نام ہے۔ قدیم مصر، بیبلونیا کے لوگ مریخ کو قہر و غضب کا دیوتا تصور کرتے تھے۔ سرخ رنگت کو اسی قہر و غضب اور غصے سے جوڑتے ہوئے اس سیارہ کو مریخ کا نام دیا گیا۔ یہ تو ایک نظریاتی فکر کی بات ہوئی، اگر ہم سائنسی نقطۂ نظر سے مشاہدہ کریں تو یہ سرخی دراصل دھبے کی شکل میں مریخ کے تین چوتھائی حصے پر قابض ہے۔ ایسے حصے کو کانٹی نینٹس (Continents) کہا جاتا ہے۔ یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'اصل زمین' بقیہ حصے کو ماریا (Maria) کا نام دیا گیا جو سیاہ ہے۔ ماریا لاطینی زبان میں 'سمندر' کے لیے مستعمل ہے، چونکہ مریخ کی اصل زمین سرخ ہے لہٰذا اس مناسبت سے مریخ کے لیے 'سرخ سیارہ' کی عرفیت قائم ہوئی۔ اب یہ سرخ دھبے ہیں کیوں؟ اس پر جب تحقیق ہوئی تو یہ معلوم ہوا کہ مٹی میں فیرک آکسائیڈ (Ferric Oxide) یا زنگ آلود لوہے کی زیادتی ہے جس کی وجہ سے مریخ کی سطح سرخ دکھائی دیتی ہے۔

مریخ اپنے حجم اور اپنی جسامت کے لحاظ سے زمین سے چھوٹا ہے۔ اس کا نصف قطر (Diameter) 6780 کلومیٹر ہے جو زمین کے نصف قطر 12799,2 کا تقریباً آدھا ہے۔ مریخ کی سطح کا رقبہ زمین کا ایک چوتھائی اور حجم زمین کا 1.7 ہے۔ یہ سورج سے دور ہے لہٰذا یہاں حدت اور روشنی کی کمی ہے۔ سورج سے اس کا فاصلہ بدلتا رہتا ہے لہٰذا حدت اور روشنی کی کمی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی۔ جب یہ سورج کے انتہائی نزدیک آجاتا ہے تو دونوں کے درمیان فاصلہ 20 کروڑ 30لاکھ کلومیٹر ہوتا ہے۔ یہی دوری انتہائی حد پر 25 کروڑ کلومیٹر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین سے مریخ کا فاصلہ بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ لہٰذا جب مریخ سورج سے قریب تر ہوتا ہے تو زمین سے اس کا فاصلہ پانچ کروڑ 60لاکھ کلومیٹر سے 9 کروڑ 80لاکھ کلومیٹر کے درمیان ہوتا ہے۔ زمین سے مریخ کی یہ قربت ہر 15 سے 17 سال کے وقفے پر نوٹ کی گئی ہے۔ لہٰذا 28/ستمبر 1988 کو مریخ زمین سے محض 5 کروڑ 88لاکھ کلومیٹر کی دوری پر آگیا تھا اور گزشتہ سال 27/اگست 2003 کو پھر یہ قربت حاصل ہوئی جب مریخ زمین سے 5 کروڑ 5لاکھ 76 ہزار کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ یہ دوری گزشتہ 60ہزار سال کے عرصے میں سب سے کم دوری درج کی گئی ہے۔ قیاس ہے کہ ان دو پڑوسیوں کے درمیان اب ایسی قربت شاید 2287 میں نصیب ہوسکے۔ سورج سے جب مریخ حد درجہ دور ہوتا ہے تو زمین سے اس کا فاصلہ 37 کروڑ 70لاکھ کلومیٹر ہوتا ہے۔

مریخ چوں کہ زمین سے چھوٹا ہے لہٰذا اس کا کشش ثقل (Gravitational Force) بھی زمین سے کم ہے یعنی زمین کی صرف 38فی صد۔ یہ سورج کے گرد اپنا طواف 687 زمینی دنوں میں پورا کرتا ہے یعنی مریخ کا ایک سال زمین کے 1/4 365 دنوں کے مقابلے میں 687 دنوں کا ہوتا ہے۔ سورج کے گرد طواف کرتے ہوئے اس کی رفتار 24 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ زمین کی ہی طرح یہ اپنی دھری (Axis) پر گھومتا ہے اور یہ دھری تقریباً 25ڈگری پر جھکی ہوتی ہے جب کہ زمین اپنی دھری پر لگ بھگ 1/2 23ڈگری پر خمیدہ ہے۔ مریخ اپنی دھری پر ایک چکر 24 گھنٹے 37منٹ اور 23 سیکنڈ میں پورا کرتا ہے اور یہی اس کا ایک دن ہوتا ہے گویا اس کا ایک دن زمین کے مقابلے میں 37منٹ اور 23 سیکنڈ بڑا ہوتا ہے۔ یہ انکشاف Giovanni Cassini نے 1663 میں کیا تھا۔

بیشتر سیاروں کے گرد چھوٹے چھوٹے طفیلی سیارے گھوم رہے ہیں۔ زمین کا ایک طفیلی سیارہ ہے چاند، مشتری کے بارہ ہیں۔ زحل (Saturn) کے نو، یورانس (Uranus) کے پانچ، نیپچون (Neptune) کے دو اور مریخ کے بھی دو طفیلی سیارے ہیں۔ یہ دونوں سیارے اس کی سطح سے بالکل قریب ہیں۔ ایک کا نام ڈیماس (Deimos) ہے جو یونانی لفظ ہے اور دہشت (Panic) کے لیے استعمال ہوتا ہے، دوسرا ہے فوباس (Phobos)۔ یہ بھی یونانی لفظ ہے جس سے خوف (Fear) مراد ہے۔ ان دونوں سیاروں کی تلاش 1877، میں Asaph Hall نام کے ماہر فلکیات نے کی تھی۔

زمین پر فضا کافی دبیز ہے۔ یہاں پانی کی جتنی بڑی مقدار موجود ہے ویسی کسی سیارے پر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کو پانی کا سیارہ (water planet) بھی کہا جاتا ہے اور اسی لیے یہ تمام ذی روح کے لیے موافق اور سازگار ماحول وفضا فراہم کرتا ہے۔ پانی کے علاوہ یہاں نائٹروجن 78 فی صد، آکسیجن 21فی صد اور بقیہ ایک فی صد میں آرگون، کاربن ڈائی آکسائڈ اور ہائیڈروجن شامل ہیں۔ تقریباً 15 میل کی اونچائی سے اوزون (ozone) کی پرت موجود ہے جو سورج سے آنے والی انتہائی مہلک بنفشی شعاعوں (ultraviolet rays) سے ہماری حفاظت کرتی ہے۔ اس کے برعکس مریخ کی فضا کافی پتلی اور رقیق سی ہے جس میں کاربن ڈائی آکسائیڈ 95.3 فی صد نائٹروجن 2.7 فی صد، آرگون 1.6 فی صد، آکسیجن 0.15 فی صد اور پانی 0.03 فی صد موجود ہے۔ وہاں اوزون کی پرت سطح سے ہی شروع ہوجاتی ہے مگر اتنی دبیز نہیں ہے کہ سورج کی مہلک شعاعوں کو روک سکے۔ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ مریخ کی فضا ایک زمانے میں دبیز تھی اور وہاں بارش بھی ہوا کرتی تھی۔ ہلکی فضا اور کم کشش ثقل کی وجہ سے مریخ پر لہریں اٹھتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے فضائی گیسیں ٹروپو پاؤز کرۂ فضا کا دراصل وہ مقام ہے جہاں گیسوں کا آپس میں ملنا بند ہوجاتا ہے۔ مریخ کی فضا ہلکی ہونے کی وجہ سے وہاں کا فضائی دباؤ (atmospheric pressure) بھی صرف 6.1 ملی بار ہے جب کہ زمین پر اوسط فضائی دباؤ 1013 ملی بار ہوتا ہے۔ وہاں بادل بھی اکثر آتے ہیں جو گرد وغبار، برف کرسٹل اور منجمد پانی پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مگر بارش نہیں ہو پاتی کیوں کہ اس کے لیے فضا سازگار نہیں۔ مریخ پر اکثر و بیشتر گردوغبار کے طوفان اٹھتے ہیں۔ اس دوران ہوا کی اوسط رفتار 280 کلومیٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ مریخ کا درجۂ حرارت سردیوں میں منفی 125 سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے اور گرمیوں میں یہ 22.2 ڈگری سینٹی گریڈ تک چلا جاتا ہے۔

زمین کی ہی طرح مریخ بھی مختلف سطحوں پر مشتمل ہے۔ زمین کی سب سے اوپری سطح کرسٹ (crust) کہلاتی ہے جو چٹانوں سے مل کر بنی ہوتی ہے اور اس کی موٹائی 5 سے 32 کلومیٹر ہوتی ہے مگر مریخ کی کرسٹ بہت دبیز اور گہری ہوتی ہے یعنی یہ 1700 کلومیٹر کے دائرہ میں پھیلی ہوتی ہے۔ وہاں دیگر معدنیات ونمکیات زمین جیسے ہی ہیں۔ مریخ کی سطح کافی ناہموار ہے اور اس پر بلند پہاڑ ہیں اور اولمپس مونس (Olympus Mons) کی چوٹی ایورسٹ سے بھی زیادہ اونچی ہے۔ ان کے علاوہ طویل گہری کھائیاں بھی ہیں۔ زمین اور مریخ کے درمیان مشابہت کی وجہ سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر زمین سے پانی غائب ہوجائے (جیسا شاید مریخ پر ہوا) تو ہماری زمین بالکل مریخ جیسی ہی نظر آئے گی۔

مریخ پر زندگی؟

سائنس دانوں کے نزدیک مریخ پر زندگی کی تلاش صدیوں سے ایک اہم موضوع رہا ہے۔ اس موضوع میں سائنس فکشن نگاروں اور فلم پروڈیوسرس نے بھی گہری دلچسپی لی ہے۔ اس سلسلے کی سب سے اہم سائنسی تصنیف ایچ.جی.ویلس (H.G.Wells) کی 'دی وار آف دی ورلڈس (The War of the worlds)' ہے جو 1898 میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے مریخ کے آکٹوپس نما باشندوں کا زمین پر حملہ کروایا تھا۔ 1938 میں اورسن ویلس (orson welles) کے مرکری تھیٹر نے اس ناول کو ریڈیو پر پیش کیا جسے خوب سراہا گیا۔ اسی سلسلے کی دوسری اہم کوششوں میں دی مارشین کرونکلس 1951 (The Martian Chronicles'51) ایبٹ اینڈ کاسٹیلو گو ٹو مارس 1953 (Abbott and costello go to mars' 53)

دی اینگری ریڈ پلانٹ 1959 (The angry red planet' 59) اسٹرینجر ان اے اسٹرینج لینڈ 1961 (Stranger in a strange land' 61) سانتا کلوز کونکرس دی مارشینس 1964 (Santa claus conquers the martians' 64) اور ایگ مونسٹرس فرام مارس 1996 (Egg monsters from mars' 96) وغیرہ شامل ہیں نیز کالی داس نے بھی مریخ کا تذکرہ کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح چاند اور مریخ نے انسان کو متاثر کیا، اس طرح کسی اور سیارے یا آسمانی چیزوں نے نہیں کیا ہے۔ چاند اور مریخ دونوں میں انسان کی دلچسپی کی اصل وجہ پانی کی تلاش ہے کہ یہ پانی زندگی کی طرف اشارے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاند پر تحقیقات کے حوالے سے روس اور امریکہ نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور آخر کار 20/جولائی 1969 کو امریکی خلاباز نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر اپنے قدم اتارے۔ اب ہمارے ملک میں بھی چاند کے متعلق ایک ''چندریان'' پروجیکٹ تیار کیا گیا ہے جو 386 کروڑ روپے کا ہے۔ اس کے تحت ہندستان کا خلائی جہاز آربیٹر 2008 میں تقریباً سوکلومیٹر کی دوری سے چاند کے گرد چکر لگائے گا اور چاند کی سطح کے متعلق معلومات وتصاویر فراہم کرے گا۔ آربیٹر میں چاند کے گرد پانچ سالوں تک چکر لگانے کی صلاحیت ہوگی۔۔۔ ہوسکتا ہے مستقبل میں چاند ہماری زمین کے بدل کے طور پر استعمال کیا جائے۔

مریخ پر تحقیقات کے لیے کئی منصوبہ بند خلائی مشن تیار کیے گئے۔ 1960 کے سب سے پہلے سرخ سیارہ مشن نے یہ اطلاع فراہم کی کہ سرخ سیارہ دراصل ایک گھاٹی کی طرح ہے جو بنجر اور خشک ہے۔ مگر اس کے بعد کہیں ٹھہراؤ نہیں پیدا ہوا بلکہ اس دھند والی فضا کو صاف کرنے کی کوششیں تیز ہوگئیں۔ مستقل غور وفکر، تجزیہ اور تلاش وجستجو سائنس کا بنیادی مزاج ہے۔ لہٰذا چار دہائیوں کی ریاضت کے بعد اب ایسے سراغ ہاتھ آئے ہیں جن سے مریخ پر پانی کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ امریکی خلائی تحقیق کے ادارہ نیشنل ایروناٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن (NASA) کے جڑواں رووررو بوٹ اسپرٹ (spirit) اور اپرچونیٹی (opportunity) نے دنیا کو روشنی کی کرن دکھائی ہے۔ یہ دونوں روورس (rovers) انتہائی حساس قسم کے آلات سے لیس ہیں جو سرخ سیارے کی معدنی سطح کی تفصیلی رپورٹ اور تصاویر زمین کو بھیج رہے ہیں جن سے سرخ سیارے کی تاریخ میں پانی کی موجودگی کے شواہد ملے ہیں۔ opportunity کے ذریعے زمین کو بھیجی گئیں سب سے پہلی رنگین تصویریں ناسا کے ذریعے 28/جنوری 2004 کو جاری کی گئیں۔ ان تصاویر سے یہ قیاس لگایا گیا ہے کہ تقریباً 4 بلین سال قبل یہاں پانی رواں تھا۔ اگرچہ ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے مگر اس کا یقین کیا جارہا ہے کہ سرخ سیارے پر پانی کہیں نہ کہیں ضرور پوشیدہ ہے اور یہ خیال محض ایک خیال نہیں ہے بلکہ امید کے سفر کا ایک پڑاؤ ہے۔ نیویارک کے کارنل یونیورسٹی کے پروفیسر اسٹیون اسکوئرس (Steven Squyres) جنھوں نے 1987 میں اس مشن کا خواب دیکھا تھا، اسے 16 سالہ محنت کا ثمرہ قرار دے رہے ہیں۔

اس سمت میں تھوڑا ماضی کا رخ کریں جہاں ایک دلچسپ واقعہ یوں سنا ہے کہ قریب ایک کروڑ 60 لاکھ سال قبل ایک بہت بڑا سیارچہ (asteroid) مریخ کی سطح پر گرا تھا۔ اس ٹکراؤ سے کئی لاکھ ہائیڈروجن بموں کی قوت والا دھماکہ ہوا تھا جس نے مریخ پر ایک بڑا گڈھا بنا دیا اور لاکھوں ٹن پتھر فضا میں منتشر ہوگئے۔ ان پتھروں میں سے کچھ تو مریخ کی سطح پر واپس آگرے مگر مریخ کی کمزور کشش ثقل اور ہلکی فضا کی وجہ سے کئی اس کی گرفت سے نکل گئے اور سورج کے گرد طواف کرنے لگے۔ لاکھوں سال کے طواف کے بعد کچھ پتھر زمین کے قریب آگئے اور زمین نے انھیں اپنی کشش ثقل سے اپنی جانب کھینچ لیا۔ لہٰذا ایک پتھر کوئی 13 ہزار سال قبل انٹارکٹکا (antarctica) پر آگرا۔ سیارچوں کی تلاش کرنے والے سائنس دانوں کی ایک ٹیم کو یہ ٹکڑا جو 4.2 پونڈ (1.9 کلوگرام) وزنی تھا، 1984 میں ایلن ہلس (Allan Hills) کے مقام پر ملا۔ اسی جگہ کی مناسبت سے اس پتھر کا نام ALH 84001 تجویز کیا گیا۔ مطالعہ وتحقیق کے بعد 1996 میں اس پتھر کے متعلق یہ انکشاف کیا گیا کہ اس میں زندگی کے آثار موجود ہیں۔ اس ٹیم کے سربراہ امریکہ کے ہیوسٹن میں واقع جونسن خلائی مرکز کے ڈیوڈ میک کے (David Mc Kay) کے مطابق اس ٹکڑے میں خوردبینی جانداروں کے باقیات یا فاسل (fossil) مادے ہیں جو 3 ارب 60 کروڑ سال پہلے مریخ پر موجود تھے۔ اس پتھر کے اندر موجود نشانیوں کی ایک مخصوص خورد بین یعنی اسکیننگ الیکٹرون مائکرو اسکوپ (scanning electron microscope) کے ذریعے تصاویر لی گئیں۔ ان تصاویر میں حیاتیاتی جرثومے یا بیکٹریا کی طرح اجسام نظر آئے۔ ساتھ ہی کاربونیٹ گلوبیول (carbonate globule) بھی دکھائی دیے۔ اس قسم کے گلوبیول کروڑوں سال پہلے زمین پر موجود بیکٹریا میں پائے گئے ہیں۔ لہٰذا ان سے مریخ پر زندگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ ان گلوبیول کا تجزیاتی کیمیائی مطالعہ کیا گیا اور یہ پایا گیا کہ ان کے اندر اور آس پاس کیمیائی مادوں کا ایک گروپ پولی سائیکلک ایرومیٹک ہائیڈروکاربن (polycyclic aromatic hydrocarbons) موجود ہیں جو دراصل خوردبینی اجسام کی

موت کے بعد ان کے تحلیل ہونے پر وجود پا جاتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لکڑی یا کوئلہ جلانے پر بھی بنتے ہیں۔ ان کے علاوہ آئرن سلفائڈس اور میگنے ٹائٹ بھی پائے گئے جن کا عموماً جانداروں سے رشتہ ہوتا ہے۔

اس پتھر کے متعلق کسی حتمی رائے پر پہنچنے میں سائنس دانوں نے خاصا وقت لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے کئی سوالات کھڑے تھے جن کا تحقیقات کے بغیر جواب پانا ناممکن تھا۔ ایک بنیادی سوال یہ تھا کہ کیا یہ پتھر مریخ کا ہی ہے؟ اس حوالے سے تحقیقات کی گئیں اور یہ فیصلہ دیا گیا کہ اس پتھر میں وہی گیسیں موجود ہیں جو مریخ پر پائی جاتی ہیں۔ ایک دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ اس پتھر میں مادوں کی ملاوٹ تو نہیں ہوگئی کہ یہ پتھر 13 ہزار سال تک قطب جنوبی پر پڑا رہا تھا۔ اس سمت کیے جانے والے تجربات کے سربراہ رچرڈ زارنے اس سلسلے میں بتایا کہ کیمیائی مادوں کی زیادہ مقدار پتھر کے اندر ہی پائی گئی ہیں لہٰذا اگر ملاوٹ ہوتی تو یہ کیمیائی مادے پتھر کے اوپری حصے پر لگے ہوتے نہ کہ اندرونی حصے میں۔ مزید یہ کہ جو کاربونیٹ گلوبیول ملے ہیں، وہ کم از کم 3ارب 60 کروڑ سال پہلے کے ہیں جب کہ یہ پتھر زمین پر صرف 13 ہزار سال قبل ہی گرا تھا۔

مریخ کے اہم مشن

تسخیر مریخ مشن پر اربوں ڈالر خرچ کیے جا چکے ہیں۔ اس سمت میں سب سے اہم پیش رفت امریکا کے مشہور خلائی سائنس کے ادارہ ناسا نے کی ہے، ناسا نے مریخ کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے، اس کی فضا کو سمجھنے اور اس کے اندرونی و بیرونی ماحول کو جاننے اور پھر زندگی کی ممکنات کی تلاش کے لیے کئی اہم مشن ترتیب دیے جن کے تحت متعدد خلائی جہاز مریخ پر روانہ کیے گئے۔ 1965 میں مے ری نر 4 (mariner 4) نامی خلائی جہاز مریخ پر بھیجا گیا۔ یہ مریخ کے مدار میں داخل ہوا اور اس کی تصاویر زمین پر بھیجیں۔ اس نے یہ بتایا کہ مریخ کی زمین گڈھوں بھری ہے اور فضا نہایت باریک، اسے ارضیاتی اور حیاتیاتی طور پر 'مردہ' قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ہی روسی مارس۔2 نے مریخ پر اپنے قدم اتارے۔ 1970 کی دہائی میں ناسا نے اس سمت مزید کامیابی حاصل کی جب 1976 میں وائکنگ اول اور دوم بالترتیب 20رجولائی 1976 اور 3رستمبر 1976 کو مریخ کی سطح پر اترے۔ وائکنگ اول مریخ کے مقام کرائسی پلنیشیا پر اترا اور اس سے 7400 کلومیٹر کے فاصلے پر یوٹو پیا پلنیشیا کے مقام پر وائکنگ دوم نے قدم جمائے۔ ان دونوں خلائی جہازوں میں لگی خودکار مشینوں اور روبوٹ نے وہاں کے متعلق معلومات فراہم کیں اور رنگین تصاویر بھیجیں۔ ان تمام سے یہ بات ابھر کر سامنے آئی کہ مریخ ایک بنجر سیارہ ہے جس کی سطح نہایت ناہموار اور بے ہنگم ہے۔ البتہ زمین ہی کی طرح ارضیاتی ساختیات موجود ہے یعنی بلند و بالا پہاڑ بھی ہیں، میدان میں گڈھے بھی ہیں اور ریت کے ٹیلے اور دراڑیں بھی۔ مریخ کے دونوں قطبوں (Poles) پر بے طرح برف جمی ہے جسے وائکنگ نے منجمد پانی بتایا تھا۔ وائکنگ کے ذریعے جمع کیے گئے مٹی کے نمونے میں بھی پانی کی مقدار موجود تھی۔ مریخ کے آسمان کو وائکنگ اول نے گلابی بتایا اور قبل کے گہرے نیلے رنگ والے خیال کو مسترد کردیا۔ دراصل مریخ کی سرخ سطح سے سورج کی منعکس شعاعوں کی وجہ سے آسمان کا رنگ گلابی تھا۔ وائکنگ مشن 1983 میں ختم ہوا۔

ناسا کو ایک اور بڑی کامیابی اس وقت ملی جب اس نے بیس سالوں کے وقفے کے بعد 1996 کے 4رنومبر کو اپنا ایک اہم خلائی جہاز 'پاتھ فائنڈر' مریخ کی طرف بھیجا۔ اس نے سات ماہ کے بعد یعنی 4رجولائی 1997 کو مریخ پر اپنے قدم اتارے۔ مارس پاتھ فائنڈر (mars path finder) کو پہلے mars environmental survey کے نام کا ایک روور بھی شامل تھا۔ اس مشن کا مقصد مریخ کی فضائی تحقیق تھا تاکہ اس سمت مزید پہلو روشن ہوسکیں۔ sojourner صرف 63 سینٹی میٹر لمبا تھا اور اس کا وزن سرخ سیارے پر صرف 5 کلوگرام تھا۔ اس کی رفتار 6ایم ایم فی سیکنڈ تھی۔ اس میں چھ عدد پہیے لگے ہوئے تھے۔ بلیک اینڈ وہائٹ اور کلر کیمرے بھی نصب تھے جن سے چٹانوں، پتھروں اور مٹی کی تصاویر لی گئی تھیں۔ اس کی چھت پر سولر پینل لگے تھے جن کی وجہ سے وہ سورج سے توانائی حاصل کرتا تھا۔ دیگر آلات میں سب سے اہم alpha proton X-ray spectrometer (APXS) تھا جو چٹانوں کی ساخت کے مطالعے میں معاون تھا اور ان کے مادوں کی تشکیل کا تجزیہ بھی کرتا تھا۔

پاتھ فائنڈر کے مریخ پر پہنچنے کے دو ماہ بعد ہی دوسرا خلائی جہاز مارس گلوبل سرویئر (Mars Global Surveyer) یعنی MGS مریخ کی فضا میں داخل ہوا۔ پانچ سالوں کے مطالعے کے دوران اس نے mariner valley کے ایک کلومیٹر اونچے تکون پہاڑ کی تصویر بھیجی۔ اسی طرح تہ در تہ گہری چٹانوں کی تصاویر بھی فراہم کیں۔ MGS پر لگے مارس آربیٹر کیمرہ (MOC) نے عہد گزشتہ میں رقیق پانی کی موجودگی کی طرف اشارے کیے۔ اس کے مطابق مریخ کا کرسٹ کرہ جنوبی میں 80 کلومیٹر دبیز ہے جب کہ شمال میں صرف 35 کلومیٹر۔ اس ایم جی ایس پر نصب (mars orbiter laser altimeter) یعنی MOLA نے مریخ کی جغرافیائی خصوصیات کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ لہٰذا 1999 میں اس کی مدد سے مریخ کی

چٹانوں، مٹی، برف، دھول اور بادل کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں۔ اس آلے نے وہاں کے پہاڑ اور گھاٹیوں کے پھیلاؤ پر بھی روشنی ڈالی۔

اکتوبر 2001 میں ناسا کا خلائی جہاز مارس اوڈیسی (Mars odyssey) مریخ پر پہنچا۔ اس پر دو اہم آلات نصب تھے۔ ایک آلہ کو Thermal Emission Imaging System (THEIS) کہا جاتا تھا جس کا مقصد وہاں کی معدنیات کی نقشہ سازی تھا اور دوسرے آلے کا نام Gamma Ray Spectrometer یا GRS تھا جو مریخ کی سطح کے نیچے پانی اور ہائیڈروجن کی تلاش میں معاون تھا۔ اس نے مریخ کی سطح سے صرف 18 انچ نیچے برف کی موجودگی کا پتا چلایا۔

مریخ پر کبھی پانی تھا اور زندگی موجود تھی، یہ خیال اس وقت تقریباً حقیقت میں بدل گیا جب یوروپی ایجنسی کے پہلے خلائی مشن کے تحت خلائی جہاز مارس ایکسپریس (mars express) نے اس سمت شواہد مہیا کیے۔ مارس ایکسپریس مریخ کے مدار میں 25 دسمبر 2003 میں داخل ہوا اور جنوری 2004 سے اعداد وشمار کی ترسیل شروع کی۔ اس مشن کا واحد مقصد مریخ پر پانی کی تلاش ہے خواہ وہ اپنی کسی بھی کیمیائی حالت میں ہو۔ جنوبی قطب کی نقشہ سازی جو امیگا (omega) نام کے آلے سے کی گئی اور جس میں کیمرہ اور infrared spectrometer لگے ہوئے ہیں، اس نے پانی اور سخت کاربن ڈائی آکسائیڈ کی موجودگی ثابت کردی ہے۔ اس نے ان تمام حصوں کی نشاندہی کردی ہے جہاں پانی کے سالمے (molecule) موجود ہیں۔ ایسے پانچ حصے ہیں جن کے نام یہ ہیں: ایمازونس (amazonis)، کرائسی (chryse)، ایلی سیم پلینیشیا (elysium planitia)، ہے لاس (hellas) اور آرگائر (argyre) یہ پانچوں حصے مل کر مریخ کی سطح کا 30 فی صد ہیں۔ مارس ایکسپریس ایک اہم مشن ثابت ہوا ہے۔ اس کے متعلق یوروپین فلائٹ آپریشنز (european flight operations) کے ڈائرکٹر مائیکل میک کے (michael mckay) کا کہنا ہے کہ ان تحقیقات ونتائج سے آگے کے مشن کو بہت تقویت ملے گی اور ہم اپنی منزل کے قریب ہوں گے۔

ناسا نے اپنے 820 ملین ڈالر مشن کے تحت پانی کی تلاش اور زندگی کی کھوج کے حوالے سے اسپرٹ (spirit) اور اپرچونٹی (opportunity) نام کے دو روور مریخ کی جانب سال رواں کے شروع میں روانہ کیے تھے۔ opportunity نے 24/جنوری 2004 کو کامیابی سے مریخ پر اپنے قدم اتارے۔ جس جگہ یہ اترا، وہ مریخ کی سب سے ہموار سطح ہے جسے میری ڈین پلینم (meridiane planum) کہا جاتا ہے۔ اس نے اب تک ساڑھے پانچ سو سے زائد تصاویر روانہ کردی ہیں جن سے مریخ کی سطح پر پڑے پردے اٹھتے جارہے ہیں۔ ان کا جڑواں روور اسپرٹ 3/جنوری 2004 کو مریخ کے گوسیو (gusev) نام کی جگہ پر اترا تھا۔ یہ جگہ opportunity کی جگہ کے بالکل برعکس یعنی ناہموار اور گڈھوں بھری ہے۔ اس میں کچھ تکنیکی خرابیاں پیدا ہوگئی لہٰذا زمین سے اس کا رابطہ دو دنوں تک منقطع رہا پھر اسے ٹھیک کرایا گیا۔ حالاں کہ اس نے خرابی پیدا ہونے کے قبل ہزاروں تصویریں لے لی تھیں مگر ان کی زمین تک ترسیل سے قبل ہی یہ خراب ہوگیا تھا۔ اب یہ دونوں روور ایک دوسرے سے بالکل مختلف سمت میں کام کررہے ہیں۔ یہ دونوں بھی اپنی توانائی سورج کی شعاعوں سے حاصل کررہے ہیں۔ ان میں چھ پہیے لگے ہیں۔ ہر ایک کا وزن 180 کلوگرام ہے۔ ان میں چار مختلف اقسام کے آلات نصب ہیں جن میں ارضیاتی مشینوں کی لیبارٹری بڑی اہم ہے جو آج کی اجاڑ اور بنجر مریخ پر گزشتہ کل کی آباد اور بھیگی بھیگی سی مریخ کی تلاش میں مصروف ہے۔ ایک mini-test spectrometer ہے جو spirit پر نصب ہے۔ اس کا کام چٹانوں میں معدنیات کی تلاش ہے۔ چوں کہ مختلف قسم کی گرم چیزیں الگ الگ انداز میں حرارت کا اخراج کرتی ہیں لہٰذا اس انداز سے یہ پتا لگایا جارہا ہے کہ وہاں کس کس طرح کی معدنیات موجود ہیں اور ان کے کتنے ذخائر ہیں۔ اسی کے ساتھ پانی سے بنے معدنیات کی تلاش بھی جاری ہے مثلاً کاربونیٹ اور چکنی مٹی، اس آلے سے درجہ حرارت پانی کے بخارات اور گرد وغبار کے متعلق بھی معلومات حاصل ہورہی ہیں۔

opportunity جہاں پر اترا وہ ہموار جگہ ہے اور grey hemalite یا iron oxide کا علاقہ ہے۔ زمین پر ایسی جگہ رقیق پانی کی موجودگی سے بنتی ہے لہٰذا سائنس دانوں کے اندر یہ جوش پایا جارہا ہے کہ اگر وہاں زنگ آلود لوہے یا rusty iron کا ذخیرہ موجود ہے تو ضرور پانی بھی ہوگا۔ اگر اس کے ساتھ کاربونیٹ اور چکنی مٹی کی تلاش کامیاب ہوجاتی ہے تو یہ کہنے میں جھجک نہیں ہوسکتی کہ مریخ پر کبھی پانی کی نہریں موجود تھیں اور اب بھی کہیں نہ کہیں پانی ضرور موجود ہے۔ 1878 میں ایک اطالوی ماہر فلکیات گیووانی شیاپریلی (giovianni schiaparelli) نے دوربین سے مریخ پر نہریں دیکھیں اور انھیں کنال (canal) نام دے ڈالا۔ قطبین پر جمی برف نے ایسا تاثر پیدا کردیا تھا کہ سائنس داں یہ سمجھنے لگے تھے کہ مریخ پر زندگی موجود ہے مگر مریخ پر دراز تحقیقات نے جلد ہی یہ بھرم توڑ دیا، دوربینوں اور کیمروں کی

مدد سے یہ بات غلط ثابت ہوگئی۔ شیاپریلی نے جن کو نہریں سمجھ لیا تھا، وہ دراصل لمبی لمبی دراڑیں تھیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ grey hemalite صرف پانی کی موجودگی سے نہیں بنتا بلکہ کبھی کبھی آتش فشانی کی وجہ سے بھی بنتا ہے۔ اگر opportunity آتش فشاں چٹانوں کی موجودگی درج کرتا ہے تو پھر پانی کی موجودگی پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے مگر ایسی صورت حال میں کچھ دیگر معدنیات مثلاً اولی وین (olivine) اور پائی روکزین (pyroxene) کی موجودگی کے ثبوت بھی ملنے چاہئیں جو آتش فشاں کے سبب بنتے ہیں۔

opportunity کا کیمرہ pan cam اور 18 دیگر کیمرے اپنی آنکھیں کھولے ان تمام ثبوت کی تلاش میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔

تازہ ترین اطلاع کے مطابق سرخ سیارہ پر سمندری پانی کی موجودگی میں تشکیل پانے والی چٹانوں کا علم ہوا ہے۔ ناسا کے ایک اعلا افسر اور سائنس داں ڈاکٹر ایڈورڈ ویلر (edward weiler) کے مطابق 2/مارچ کو یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اپرچونیٹی نے ایسی تصاویر بھیجی ہیں جن سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ مریخ پر کبھی سمندر رہا تھا۔ پروفیسر اسٹیون اسکوئرس کے مطابق وہ جگہ جہاں اپرچونیٹی اترا ہے، اس کے نیچے ہی یہ سمندر رواں تھا۔ سمندری پانی میں بننے والی ان چٹانوں میں کلورین اور برومین کی موجودگی نوٹ کی گئی ہے۔ اس انکشاف سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ چٹانیں ایک زمانہ میں زیر آب تھیں۔ یو.ایس. اسٹیٹ جیولاجیکل سروے کے سائنس داں ڈاکٹر ڈیوڈ روبن (David Rubin) نے اس تلاش پر اپنی سخت حیرت اور بے پناہ خوشی کا اظہار کیا ہے کہ یہ تلاش مریخ پر زندگی کے امکانات کو اور زیادہ اعتبار بخشتی ہے اور ایک درخشاں باب کا اضافہ کرتی ہے۔

اوپر بیان کیے گئے اہم اور کامیاب خلائی مشن کے علاوہ مثلاً 1971 میں روس کا مارس-3 جو صرف بیس سیکنڈ تک ہی اعداد و شمار بھیج پایا، 1973 میں مارس-4 جو مدار حاصل کرنے میں ناکام رہا اور چند تصاویر ہی بھیج سکا، 1973 میں ہی مارس-5 صرف ایک دن کام کر پایا۔ حالیہ بیگل-2 (Beagle-2) خلائی جہاز جو امریکہ اور روس کے باہمی تعاون سے قزاکستان کے خلائی اسٹیشن سے جون 2003 میں مریخ کی طرف روانہ کیا گیا۔ اسے 25/دسمبر 2003 تک مریخ تک پہنچنا تھا مگر مارس ایکسپریس اور mars odyssey جیسے خلائی جہازوں کے ذریعے رابطہ قائم کرنے کی مسلسل کوششوں کے باوجود کوئی رابطہ بحال نہیں ہو پایا۔

ناسا نے فی الحال مریخ پر خلابازوں کے بغیر خلائی جہاز بھیجنے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ مریخ پر خلاباز بھیجنے کا خرچ 1989 میں لگائے گئے ایک تخمینہ کے مطابق 400 ارب ڈالر کا ہے۔ ایندھن کی فراہمی اور اس کے اخراجات بھی بڑے مسائل ہیں۔ مریخ سے واپسی کے لیے بھی کافی ایندھن چاہیے جسے زمین سے ہی اپنے ساتھ لے جانا پڑے گا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایندھن ساز مشین کیپسول کا خاکہ بنایا گیا ہے جو خلائی مشن سے پہلے مریخ پر بھیج دی جائے گی۔ وہ وہاں ایندھن بنائے گی۔ دوسرے مرحلے میں ایک خالی راکٹ بھیجا جائے گا جو مریخ کے مدار میں گردش کرتا رہے گا اور تیسرے مرحلے میں خلاباز بھیجے جائیں گے جو مریخ پر تجربات کرنے کے بعد ایندھن ساز مشین کے کیپسول کی مدد سے مریخ کے مدار میں پہنچیں گے۔ پھر یہ کیپسول پہلے سے گردش کررہے خالی راکٹ سے جڑ کر زمین کی طرف واپس ہوگا۔ یہ خاکہ اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان کے مریخ پر جانے کی تیاری بھی چل رہی ہے۔ ان تمام کامرانیوں کے پیش نظر بہت ممکن ہے کہ مشہور سائنس فکشن نگار سی کے اینڈرسن (C.K. Anderson) کے ناول اے اسٹیپ بی اونڈ (A Step Beyond) جو مریخ تک انسانی سفر کی کہانی ہے اب حقیقت کا روپ لے لے۔

(بشکریہ "یوجنا" نئی دہلی، مئی 2004)

ooo

مریخ کے چند دیگر حقائق

- ☆ 1609۔ Johannes Kepler نے مریخ کے مدار کی پیمائش کی۔
- ☆ 1659۔ Christians Hugens نے مریخ کی پہلی تصویر بنائی۔
- ☆ 1784۔ William Herschel نے زمین اور مریخ کے درمیان رشتہ کو واضح کیا۔
- ☆ 1840۔ Johann Maedler نے مریخ کا پہلا نقشہ شائع کیا۔
- ☆ 1864۔ William Rutter Dawes نے مریخ کا صحیح نقشہ بنایا۔
- ☆ 1907۔ Alfred Russel Wallace نے مریخ کی سطح کو منجمد اور زندگی کی مخالف بتایا۔
- ☆ 1947۔ Gerad Kuiper نے مریخ پر کاربن ڈائی آکسائڈ کا پتا لگایا۔
- ☆ 2019۔ مریخ پر انسان کے قدم؟

حکیم اشہر قدیر

عہد حاضر اور فلسفۂ صحت

آج لا علاج امراض کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے ہے۔ کینسر اور ایڈس جیسے موذی امراض تو انسان کو نگلنے کے لیے منہ پھاڑے کھڑے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ معمولی امراض جیسے نزلہ، زکام، کھانسی، بخار، دست، قبض، سردرد، بدن درد اور عام جسمانی کمزوری وغیرہ بھی انسان کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ جدید میڈیکل سائنس نے ان تمام امراض پر تحقیق کرنے کے بعد ان کا شافی علاج مہیا کرنے کا دعوا کیا ہے لیکن پھر بھی یہ امراض جوں کے توں موجود ہیں۔

آخر کیا وجہ ہے کہ آج قدم قدم پر بہترین اسپتال اور قابل معالجین مہیا ہونے کے باوجود زیادہ تر لوگ کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا ہیں اور دوا سے وقتی آرام ملنے کے باوجود مرض دوبارہ لاحق ہوجاتا ہے اور انسان عمر بھر کے لیے دواؤں کا اسیر ہوجاتا ہے؟

اگر اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علاج صرف مرض کا ہی نہیں بلکہ اسبابِ مرض کا بھی ہونا چاہیے۔ یہ کافی نہیں کہ مرضی علامات کے مطابق دوا دے کر مریض کو شفاخانے سے گھر روانہ کردیا جائے بلکہ مریض کے مزاج کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔ یعنی مریض کس ماحول سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا رہن سہن کیسا ہے۔ اس کی غذا کی نوعیت کیا ہے۔ گھر میں خوش حالی ہے یا تنگ دستی ہے، گھر کے باہر کا ماحول کیا ہے، صاف ستھرا ہے یا آلودہ ہے۔ چونکہ یہ تمام امور مرض کے پیدا ہونے اور پھیلنے میں معاون ہیں، بلکہ مرض کے حقیقی اسباب یہی ہوتے ہیں اور جب تک ان اسباب پر نظر نہ رکھی جائے تب تک مرض کا مکمل علاج ممکن نہیں۔

آج ہمارے سماج میں ہر طرح کے مادّی اور نفسیاتی مسائل موجود ہیں جن کی وجہ سے مختلف امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارا ملک ایک ترقی پذیر ملک ہے جہاں آبادی کا مسئلہ سنگین ہے، عوام میں تعلیم بھی قدرے کم ہے اور بیشتر افراد اقتصادی بدحالی سے دوچار ہیں۔ ان اسباب کی بنا پر قدرتی ماحول کا تناسب بھی درہم برہم ہوگیا ہے۔ ہوا، پانی اور غذا میں قلت اور ملاوٹ پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی ترقی کی ہوڑ سے الگ پریشان ہے جس سے جسمانی اور دماغی سکون غارت ہوگیا ہے۔ کہیں ایسا شور شرابہ ہے کہ انسان پاگل ہوا جاتا ہے اور کہیں ایسی تنہائی ہے کہ انسان دیواروں سے باتیں کرنے پر مجبور ہے۔

تاریخ طب کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ قدیم اطبا مرض کے ساتھ ساتھ مریض کے ماحول کا بھی جائزہ لیتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی درج ہیں کہ جہاں بغیر کسی دوا کے صرف حکمتِ عملی سے ہی شفا حاصل ہوگئی۔ بعض امراض میں مریض کے ماحول کو تبدیل کرنا ضروری ہوجاتا ہے تاکہ اس کی آب و ہوا تبدیل ہو۔ اسی طرح کبھی مریض کو تنہا چھوڑنا یا کبھی چند افراد کے بیچ میں رکھنا بھی علاج کا حصہ ہے۔

اصولِ علاج سے متعلق یہ نکتہ اہم ہے کہ انسانی جسم ایک قدرتی مرکب ہے اس لیے قدرتی ماحول مہیا کرنا اس کی صحت کا ضامن ہے۔ انسانی جسم میں ایک قوت پائی جاتی ہے جس کو "طبیعت" کا نام دیا گیا ہے۔ یہ وہ قوت ہے جو انسان کے تمام افعال کو درست رکھنے اور اس کو امراض سے محفوظ رکھنے کے لیے ذمے دار ہے۔ اگر ماحول پاک و صاف ہو، اور ہوا، پانی اور غذا عمدہ اور ضرورت کے اعتبار سے کافی ہو۔ اس کے علاوہ دماغ کسی ہیجان میں مبتلا نہ ہو، بدنی حرکات و سکنات بھی اعتدال پر ہوں تو طبیعت کمزور ہوجاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں بدن میں امراض کو قبول کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور معمولی امراض جیسے نزلہ، کھانسی، بخار، سردرد وغیرہ ہر وقت جسم کو گھیرے رہتے ہیں، اور اگر ایک بار جسم کسی مرض کا شکار ہوجائے اور اس کا صحیح علاج نہ ہو تو وہ مرض عود کر آتا ہے۔ اگر مرض کے ازالے کے لیے بار بار دوا استعمال کی جاتی ہے تو طبیعت بھی دوا کی عادی ہوجاتی ہے اور پھر جب تک دوا نہ لی جائے مرض سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی مرض کا صرف دوا سے علاج کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ سب سے زیادہ اہم کام بدن کی دفاعی قوت کو قوی کرنا ہے جس کا انحصار ماحول کی درستگی پر ہے، اور ماحول کی درستی ایک اجتماعی عمل ہے۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد حالات سے باخبر ہو اور اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرے۔ ہمارے اردگرد کا ماحول اسی صورت میں صحت مند ہوگا جب انسانی امراض کے بنیادی اسباب کے بارے میں جانے گا۔ اگر ہر شخص دو چیزوں پر عمل کرلے، ایک خاندانی منصوبہ بندی اور دوسرے بچوں کی تعلیم و تربیت پر دھیان دینا تو امید ہے کہ مستقبل میں ایک صاف ستھرا ماحول تشکیل پاسکے گا جو صحت مند معاشرے کی بنیاد ہوگا۔

157/A, Ghaffar Manzil,
Jamia Nagar,
Delhi-110025

□□□

تحریر: رخشندہ جلیل
ترجمہ: ظفر انصاری ظفر

احمد فراز سے گفتگو

احمد فراز کی شاعری رومان و تخیل، احتجاج و حسیت اور حریت و تفکر کے ایک حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ اُن کی شاعری کے متعلق فیض احمد فیض نے کہا تھا کہ "وہ ظلم و ناانصافی کے خلاف اتنی ہی شدت سے احتجاج کرتے ہیں جتنی شدت سے محبت کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ ایک Living Legend بن چکے ہیں اور بعض معنوں میں پاکستان کی اولین مقبول ترین شخصیت ہیں۔ اُن کی شہرت پاکستان کی حدود کو عبور کرچکی ہے۔ ان کی غزلیں ہندستان میں بھی کافی مقبول و مشہور ہیں اور غلام علی، مہدی حسن، رونا لیلیٰ، جگجیت سنگھ وغیرہ نے اپنی آواز دے کر ان میں مزید چار چاند لگا دیے ہیں۔ معاصر غزل گویوں نے ان کی کافی تعریف کی ہے۔ 74سالہ احمد فراز کا قلم آج بھی اسی رفتار سے چل رہا ہے۔ گذشتہ دنوں وہ دہلی میں منعقدہ مشاعرہ جشنِ بہار میں شرکت کے لیے دہلی آئے تو رخشندہ جلیل نے ان سے شاعری، سیاست اور عوام سے متعلق گفتگو کی۔ اس کے اہم حصے قارئینِ اردو دنیا کی نذر ہیں۔

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

احمد فراز

سوال: تقسیم کے سانحے، اور مارشل لا کے صدمے برداشت کرتے ہوئے پاکستان میں اردو شاعری زندہ رہی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ شاعری کی آواز کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کے باوجود یہ پروان چڑھی۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ شاعری کو اپنے اظہار کے لیے عدم استحکام اور ظلم و ستم جیسے عناصر کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیا یہ ان کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے؟

جواب: پاکستانی شاعری کو مؤثر بنانے میں ان تمام عناصر کا اہم رول رہا ہے۔ ابتدا سے ہی ہمارے سیاست داں یا تو اپنا اعتماد کھو چکے ہیں یا پھر ذاتی مفاد کے لیے ان کا سودا کیا ہے۔ محض چند ہی قلم کار جو یا تو جیل میں تھے یا جن کو ریڈیو اور ٹی.وی. پر جانے کی ممانعت تھی یا جن پر کچھ بھروسہ کرکے ایک ریاست سے دوسری ریاست میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ملک میں لگنے والے تمام مارشل لا شعرا کے لیے سخت تھے لیکن ان میں کچھ مارشل لا زیادہ ہی سخت تھے۔ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لا بدترین تھا۔ اس کے ذریعے وہ ایک طرف تو بنیاد پرستوں کو بڑھاوا دے رہے تھے اور دوسری طرف ترقی پسند مفکرین کو سزا دے رہے تھے۔ یہ دور ہمارے ملک کے قلم کاروں کے لیے بڑا ہی نازک تھا۔ اس چیز نے شعرا کی فکر کو تقویت فراہم کی اور احتجاجی شاعری کو پاکستان میں مقبولِ عام کیا۔

سوال: آپ کی شاعری کا پہلا مجموعہ "تنہا تنہا" 1950 میں شائع ہوا، اس وقت آپ انڈرگریجویٹ طالبِ علم تھے۔ اس زمانے میں کن شعرا سے آپ متاثر ہوئے؟

جواب: اس زمانے کے شعرا میں کچھ نام مثلاً فیض، غالب، حفیظ، ن.م. راشد، ساحر لدھیانوی وغیرہ کافی مشہور اور مرکز توجہ تھے۔ ترقی پسند تحریک اس وقت اپنے شباب پر تھی۔ میری طرح سبھی نوجوان قلم کار اس سے متاثر تھے۔ ہم سارے لوگوں کے حالات یکساں تھے اس لیے فطری طور پر ہمارے محسوسات بھی ایک جیسے تھے۔ اگر ماحول میں غبار ہے تو تمام لوگ اسی غبار آلود فضا میں سانس لیں گے۔ فرق صرف سانس چھوڑنے کے عمل میں ہوگا۔ میں فیض سے بے حد متاثر تھا، بالکل اسی طرح جیسے میرے دیگر معاصر شعرا سردار و مجروح سے متاثر تھے۔ دراصل فیض ہی تنہا ایسے شاعر تھے جنھوں نے پوری نسل کو متاثر کیا۔ رومانی، غنائی اور احتجاجی عناصر جن سے ان کی شاعری کا خمیر تیار ہوا، وہ ہم سبھی میں کم و بیش موجود ہیں۔

سوال: یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی شاعری کو فیض کا لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ابتدائی زمانے میں مجھ پر فیض کا بڑا اثر تھا لیکن ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جن میں بالخصوص فارسی شاعر نظیری بھی شامل ہیں، کا بھی اثر رہا ہے۔ فیض نے شاعری کے روایتی محاوروں کو آسان لفظوں اور پیکروں میں ڈھال کر نئے معنی سے آراستہ کیا۔

سوال: آپ کی شاعری میں حسین سادگی بڑی اہمیت کے ساتھ راہ پا گئی ہے اور ہندی کے صاف و شفاف

الفاظ بھی جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔ مثلاً آپ کی غزل "کٹھن رہ گزر کی"۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اردو کو ایک ادبی زبان کی صورت میں زندہ رہنا ہے تو اسے اپنی لفظیات کو وسعت دینا ہوگی ورنہ اس کی جڑیں خشک ہو جائیں گی۔ اسے ہندی، فارسی اور تمام دیگر زبانوں سے زیادہ سے زیادہ الفاظ مستعار لینے ہوں گے۔ میری نسل کے اردو شعرا کے لیے فارسی زبان نے روایتی علامت "شمع اور پروانہ" کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیا ہے۔ تقسیم کے بعد اُن لوگوں نے اردو سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکال دیے اور یہاں ان لوگوں نے ہندی کے نرم و شیریں الفاظ کو ہٹا دیا اس طرح سرحد کے دونوں جانب اردو زبان سیاست کا شکار ہو گئی۔ اردو شعرا بے دست و پا ہو گئے۔ فارسی اپنی وسیع لفظیات کے ساتھ ایک شیریں زبان ہے۔ اس کے محاورے بڑے ہی موزوں اور زبان بڑی ہی نرم اور دلنشیں ہے۔ اردو زبان اور شاعری پر اس کا کافی اثر رہا۔ ہندی میں بھی اسی طرح نرم و شیریں الفاظ تھے جو کہ نئی سنسکرت زدہ ہندی میں متروک قرار پائے۔ فیض نے اسی گنگا جمنی زبان کو اثر انگیز طریقے سے برتا ہے۔ بعض اوقات اردو کی تہی دامنی اور اس کی محدودیت کا احساس ہوتا ہے۔ روایتی امیج اور تشبیہات باعثِ تکدر ہوتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو شاعروں کو چاہیے کہ وہ ان دائروں سے اوپر اٹھیں۔

سوال: آپ کو عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ آپ اپنی آئندہ نسل بالخصوص جوانوں تک اسے کیسے پہنچائیں گے؟

جواب: ابھی نوجوانوں کو تو اس مشعل کو لے کر آگے بڑھنا ہے کیونکہ یہ اس کمی کو پورا کرنے والے ہیں۔

سوال: ایک جملے میں آپ خود کو کیا کہیں گے، ایک غنائی شاعر، ایک رومانی انسان یا ایک مجاہد؟

جواب: میں محض ایک شاعر ہوں۔ یہ تمام صفات لایعنی ہیں۔ آپ شاعر کو مختلف خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ آپ خواہ رومانی یا احتجاجی شاعری کر رہے ہوں، شاعری کو غالب ہونا چاہیے۔ غنائیت، جذباتیت اور تفکر کے امتزاج سے ایک سنگیت پیدا ہونا چاہیے جس میں زبان کی لطیف غنائیت ہو، جسے اردو میں جذبِ اعظم کہا جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ شاعری کو بعید از فہم نہیں ہونا چاہیے اور اس سے لطافت، حلاوت اور کوملتا کا استخراج نہیں کرنا چاہیے۔ صرف نظریہ شاعری نہیں بن سکتا۔ الفاظ کے زیر و بم سے اسے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ لفظوں کا انتخاب بہت ضروری ہے اور اسی کے ساتھ بحر اور وزن بھی۔ جنگ کے ترانے کے زیر و بم اور لے کسی رومانی نظم سے بالکل علاحدہ ہوں گے، لیکن اسے اَن میوزیکل نہیں ہونا چاہیے۔

سوال: آپ اپنے کیریر کے بارے میں مختصراً بتائیے؟

جواب: میں نے اپنے کیریر کی شروعات ریڈیو اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے کی۔ اس کے بعد میں نے اردو تدریس کا کام شروع کیا۔ پھر نیشنل سینٹر (جس کا مقصد بنیادی طور پر مشرقی اور مغربی پاکستان کی تہذیبی زمین کو ہموار کرنا تھا) کا ڈائرکٹر بنا۔ اس کے بعد میں اکیڈمی آف لیٹرس سے منسلک ہو گیا اور اس کے پہلے پروجیکٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد نظر بند کر دیا گیا۔ مجھے ایک انجان جگہ پر رکھا گیا۔ عدالت نے مجھے رہا کیا لیکن میں نے برسوں تک افریقہ، یورپ اور دیگر کئی جگہوں پر جلاوطنی کی زندگی گزاری۔ ملک واپس آنے کے بعد کچھ عرصے "لوک ورثہ" کی سرپرستی کی۔ ان دنوں میں نیشنل بک فاؤنڈیشن جو کہ پاکستان کا سب سے اعلا اشاعتی ادارہ ہے اور جس کا کام ملک بھر میں کتب کی فراہمی اور اشاعتِ کتب کی ترقی اور فروغ ہے کا میں نیجنگ ڈائرکٹر ہوں۔ یہ ادارہ کتاب میلوں کا انعقاد کرتا ہے اور حکومت کے لیے نیشنل بک پالیسی بھی تیار کرتا ہے۔

سوال: آپ ہندستان ایک مدت سے آتے جاتے رہے ہیں؟ کیا اس بار ہندستان میں آپ کی خصوصی آمد پر کوئی ایسی چیز ہے جو آپ کو کسی تبدیلی کا احساس دلاتی ہے؟

جواب: میرے لحاظ سے یہاں کوئی بھی تبدیلی نہیں ہے۔ میں جن لوگوں سے ملتا ہوں وہ ہمیشہ سے ویسے ہی ہیں اور اُن کے لیے میں بھی ویسا ہی رہا ہوں۔

سوال: کیا پاکستان میں بھی ان دنوں دونوں ملکوں کے رویوں میں موجودہ بدلاؤ سے ایسا ہی محسوس کیا جا رہا ہے؟

جواب: جی ہاں۔ ہندستان کے بارے میں اُن کے خیالات میں تبدیلی آئی ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ امن اور آشتی چاہتے ہیں اور دوسرے معاملات میں بہتری کے خواہاں ہیں۔ لہجے کی کرختگی ختم ہونے لگی ہے اور روشن خیالی بھی آئی ہے کیونکہ لوگوں کو اپنی حکومت پر اعتماد نہیں ہے، حکومت کے ذریعے کسی بھی اقدام پر بھروسہ نہیں ہے۔ اخیر میں میرا کہنا یہی ہے کہ دونوں طرف کے عوام کو ایک دوسرے سے روابط بڑھانے سے ہی زیادہ بدلاؤ آئے گا۔

سوال: کیا آپ کو لگتا ہے کہ گرم جوشی دکھانے، امن کی بات کرنے اور دوستی کے قیام کے لیے لوگوں کو ہدایت دی گئی ہے؟

جواب: ہدایتیں وہاں ہوتی ہیں جہاں ہاتھ اٹھانے اور گرانے کا حکم دیا جاتا ہے۔

سوال: دونوں ملکوں کے عوام کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: ہندستان اور پاکستان دونوں ممالک کے عوام کو اس بات پر زور دینا چاہیے کہ وہ اپنے ارادوں کو سیاست دانوں سے قبول کروائیں۔ دونوں ممالک کے عام لوگوں کے درمیان بہتر سے بہتر روابط پیدا ہوں۔ عوام کو چاہیے کہ وہ سیاست دانوں کو بتائیں کہ وہ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان روابط بڑھانے اور دل جیتنے کے بجائے اسکولوں، بم اور فوج پر کیوں پیسے برباد کرتے ہیں۔

(بشکریہ "دی ہندو" نئی دہلی، 2 مئی 2004) ❑❑❑

حمیدہ چوپڑا

گزارش بہ زبانِ اردو

ایک چھوٹی سی گزارش لے کر آپ کے سامنے حاضر ہوئی ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم دو بہنیں ہندستان میں پیدا ہوئیں، وہیں پلی بڑھیں اور پروان چڑھیں۔ ہمارا تعلق ''پراکرت'' خاندان سے تھا۔ ہم بچپن میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں۔ آپس میں خوب کھیلتیں جیسے دو بہنیں اکثر کرتی ہیں۔ کبھی الفاظ اُدھار لیے، کبھی ایک دوسرے کے خیال چرائے، کبھی مل کر محاورے بنائے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی ہماری پرورش بہت پیار سے کی۔ خسرو چاچا تو ایک زانو پہ مجھے اور دوسرے پہ میری بہن کو بٹھاتے تھے۔ دھیرے دھیرے ہم بڑی ہونے لگیں، ہماری شخصیت اُبھرنے لگی، ہماری دلچسپیاں بدلنے لگیں۔ میری بہن سنسکرت سے زیادہ قریب ہوئی اور دیوناگری لباس اپنایا۔ میں نے عربی اور ایرانی لباس زیب تن کیا مگر تراش خراش ہندستانی تھی۔ اُس کی بڑی عزت تھی۔ ہم بہنوں میں کوئی خلش نہیں تھی۔ حالات بدلتے گئے۔ میں دلی سے دکن پہنچی۔ انگریزوں کے زمانے میں مجھے سرکاری زبان کا درجہ ملا۔ پھر ہماری تاریخ کا تاریک زمانہ آیا۔ ملک تقسیم ہوا، پاکستان نے مجھے اپنی قومی زبان قرار دیا۔ یوں سمجھیے میں پاکستان بیاہی گئی، یہ گویا میرا قصور ٹھہرا۔ میکے والوں نے مجھے بالکل بھلا دیا۔ جو زیادتیاں مجھ پر ہوئیں اُس کا ذکر نہیں کرتی کہ اُس سے کچھ حاصل نہیں، لیکن اب بھی جو کچھ ہو رہا ہے اُس سے دل بہت دُکھتا ہے، خاص طور سے جب یہ دیکھتی ہوں کہ ایک غیر زبان جس کا ہماری تہذیب و تمدن سے کوئی واسطہ نہیں، جس کے بولنے والوں نے ہمیں برسوں غلام رکھا، اُس کی وطن میں قدر کی جاتی ہے۔ کیا چھوٹے کیا بڑے، کیا امیر کیا غریب، حتیٰ کہ گاؤں کے لوگ تک اسے سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔ اسکول، کالج میں پڑھائی جاتی ہے، دفتروں میں بولی جاتی ہے اور میں جو اس دھرتی کی کوکھ کی پلی، گود کی کھیلی ہوں، میری ناقدری کرتے ہیں۔ اسکول، کالج سب جگہ سے نکالی گئی۔ مگر قدرت کا کرنا کچھ ایسا ہے کہ میری مٹھاس انھیں میری طرف کھینچتی ہے، یہ مجھ سے حظ اٹھاتے ہیں، ایک دوسرے کو میری غزلیں اور اشعار بھیجتے ہیں مگر اب ایک نیا طریقہ جفا کا اختیار کیا گیا ہے، مجھے رومن لباس پہناتے ہیں اور وہ لباس مجھ پر بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں اُس لباس میں غیر لگتی ہوں، میرا حلیہ ہی بدل جاتا ہے۔ میری آپ سب سے یہی گزارش ہے، وقتی ہے کہ یہ ظلم مجھ پر نہ کریں۔ مجھے میرے لباس ہی میں رہنے دیں جیسا کہ میں نے کہا، ہم دو بہنیں ہیں اور دونوں نے ایک ہی خاندان میں پرورش پائی ہے سو ہمارے اصول ایک ہیں، ہماری گرامر ایک ہے، اس لیے ہندی جاننے والوں کے لیے مجھے جاننا بہت آسان ہے۔ صرف چند گھنٹوں یا کہ چند ہفتوں کی بات ہے۔ ہاں خدا لگتی کہوں گی، آج بھی وطن میں بہت سے لوگ مجھے پیار کرتے ہیں۔ میرا خیال کرتے ہیں، ضرور سیکھنے والوں کی مدد کریں گے۔ لوگ اتنا اتنا وقت اور اتنی محنت ایک اجنبی اور غیر ملکی لباس مجھ پر فٹ کرنے کی کوشش میں لگا رہے ہیں، اُس سے بہتر تو یہی ہے کہ وہ وقت میرے اسی لباس کی تزئین میں لگائیں جو خود مجھے بہت عزیز ہے جس میں میرے حسن کا پورا نکھار ہے۔ اُمید کرتی ہوں میری اس گزارش پر غور کریں گے۔ مجھے میرے اپنے گھر میں وہ پیار، وہ عزت اور وہ رتبہ دیں گے جس کی میں مستحق ہوں، آخر میں بھارت کی بیٹی ہوں۔

آپ کی اپنی اردو

635, Crossridge Ter (925) 254-9275,
ORINDA, CA 94563

□□□

جوابات: کوئز

1. ج	2. ب	3. ج	4. ج	5. د	6. الف
7. د	8. د	9. ج	10. ج	11. د	12. الف
13. ج	14. ب	15. د	16. د	17. ب	18. و
19. د	20. ب	21. الف	22. الف	23. د	24. ب
25. ج	26. الف	27. ب	28. ج	29. د	30. ج
31. ب	32. الف	33. د	34. ب	35. الف	36. د
37. الف	38. د	39. ب	40. ج	41. د	42. الف
43. ب	44. ج	45. د	46. ج	47. د	48. ج
49. ب	50. الف	51. الف	52. ب	53. الف	54. ج
55. ج	56. الف	57. ب	58. د	59. ب	

ملک زادہ جاوید

امیر آغا — ایک تاثر

نومبر 1990 کا ذکر ہے۔ میری ملاقات امیر آغا قزلباش سے دہلی کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ خوبصورت، کسرتی بدن، رنگ گورا اور معیاری کلام کے ساتھ ساتھ تحت میں اشعار سنانے کے انداز نے مجھے بہت متاثر کیا۔ مشاعرے کے درمیان ہی وہ جب لڑکھڑاتے قدموں سے Stage سے نیچے اُترنے لگے تو میں نے انھیں سہارا دیا اور خود کو اُن سے متعارف کروایا۔ انھوں نے پوچھا ''شراب پیتے ہو'' میں نے کہا ''نہیں''، ''پپلو کھیلنا جانتے ہو'' اس پر بھی میں نے نہ میں سر ہلایا ''عشق وشق'' کا تو کچھ سلسلہ ہوگا، میں نے انکار کیا۔ انھوں نے غور سے مجھے دیکھا اور بولے ''کیسے انسان ہو، کوئی اچھی عادت تمھارے اندر نہیں ہے۔ شہر دلی میں انسان بستے ہیں فرشتے نہیں۔ لکھنؤ واپس چلے جاؤ'' یہ کہہ کر وہ مجھے حیرت زدہ چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ امیر آغا سے میری دوسری ملاقات اتفاق سے کچھ ہی دنوں بعد دلی اردو اکادمی کے مشاعرے میں ہوگئی۔ مشاعرے کے اسٹیج پر انھوں نے مجھے دیکھ کر کہا ''اچھا تو آپ شاعر بھی ہیں؟'' میں نے کہا ''جی''، ''خیر آپ یہ بتائیں کہ آپ نے کوئی اچھی عادت اپنائی؟''

......میں نے جواب دیا ''جی ہاں پپلو کھیلنا سیکھ رہا ہوں۔ ایک دو لڑکیوں سے میل جول بڑھانے کی کوششوں میں مصروف ہوں۔ شراب کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''، ''کوئی بات نہیں ہے تم نے ابتدا تو کردی، ایک دن انتہا تک پہنچ جاؤ گے'' امیر آغا بولے۔

اُس وقت دہلی کے ادبی منظرنامے پر جو چند حضرات شفق بن کر چھائے ہوئے تھے اُن میں دو طرح کے شعرا تھے ایک وہ تھے جو کہ خواص تک محدود تھے اور مجموعوں کی اشاعت اور اردو رسائل تک ان کی پہنچ تھی جس کے ذریعے وہ اپنے قد کو نکھارنے اور سنوارنے کے عمل میں مصروف تھے۔ دوسری طرح کے شعرا میں وہ تھے جن کی آمد و رفت مشاعروں میں بھی تھی اور ان کی ایک ادبی حیثیت بھی مسلّم تھی، جس کے سبب وہ عوام و خواص میں یکساں طور پر پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ ایسے لوگوں میں مخمور سعیدی، امیر آغا قزلباش، کمار پاشی، حیات لکھنوی، رفعت سروش، زبیر رضوی اور نور جہاں ثروت کا نام لیا جاسکتا ہے۔ یہ شعرا صرف دہلی کی سرحد تک ہی نہیں جانے پہچانے جاتے تھے بلکہ اردو دنیا ان سے واقف تھی، چنانچہ پورے ہندستان کے مشاعروں میں یہ حضرات دہلی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان لوگوں میں امیر آغا، مخمور سعیدی، حیات لکھنوی، کمار پاشی کی قربتیں اور ان کی شب باشیوں کے قصوں سے دلی والے بخوبی واقف ہیں۔

مے نوشی کے سلسلے میں حکیم بوعلی سینا کا قول ہے کہ اگر اسے مناسب مقدار میں استعمال کیا جائے تو یہ صحت کے لیے بہت مناسب چیز ہے۔ مگر یہ کافر جس کے منہ لگ جاتی ہے اسے مقدار کا خیال نہیں رہتا۔ مے نوشی نے اردو دنیا کے کئی روشن چراغوں کو آفتاب بننے کا موقع نہیں دیا اور وہ وقت سے پہلے ہی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے — ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ امیر آغا ایک حساس قسم کے انسان تھے۔ ان کی شاعری عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق تھی۔ اردو کے عام فہم الفاظ سے انھوں نے اپنے افکار و خیالات کو سجایا تھا، ان کا ہر شعر فکر کے نئے نئے دروازوں کو کھولتا ہوا نظر آتا ہے۔ امیر آغا ایک تناور درخت کے روپ میں ابھرے اور نئی غزل کو یہ گھنا سایہ دار درخت اتنا راس آیا کہ اس نے امیر آغا کی شاعری کو معتبر کہہ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

امیر آغا قزلباش سے میری قربت اُس وقت زیادہ بڑھ گئی جب وہ لکشمی نگر کے علاقے میں ''بردرس اپارٹمنٹ'' میں آکر رہنے لگے۔ چونکہ وہ جگہ نوئیڈا کے قریب تھی، اس لیے اکثر تاش کی محفلیں ان کے یہاں سجنے لگیں۔ وہ ان دنوں وہاں تنہا رہتے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کی ایک خاتون دوست اور انھوں نے مل کر یہ فلیٹ خریدا ہے، چونکہ ان خاتون کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لیے ایک دن میں نے امیر آغا سے دریافت کیا کہ آپ کی خاتون دوست کبھی نظر نہیں آئیں، کیا وہ کہیں اور رہتی ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ وہ امریکہ گئی ہوئی ہیں اپنی بیٹی کے پاس (کچھ لوگ کہتے ہیں کہ موصوفہ سے امیر آغا نے شادی کر لی تھی)۔ غالباً موصوفہ کے پہلے شوہر سے کوئی بیٹی تھی جو وہاں رہتی تھی اُس دوران امیر آغا تنہا اُس فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ احساسِ تنہائی کا ناگ انھیں لمحہ لمحہ ڈستا رہتا تھا جس کی وجہ سے وہ ضرورت سے زیادہ مے نوشی کرنے لگے۔ صبح ہوتے ہی وہ شغل میں مصروف ہوجاتے تھے۔ ان کے کئی قریبی دوستوں نے انھیں بارہا سمجھایا۔ میں نے بھی کئی بار انھیں ٹوکا مگر وہ اس معاملے میں تمام حدوں کو پار کرچکے تھے۔ کوئی غم انھیں اندر اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ وہ موت کے بے کراں سمندر میں ڈوب جانا چاہتے تھے۔ جب ان کا دل تنہائی سے اوب جاتا تھا تو دوستوں کو فون کیا کرتے تھے، تاش کی محفلیں سجاتے تھے، اپنے گھر دوستوں کو بلا کر کھانا کھلاتے تھے (اپنے ہاتھوں پکا کر)۔ ایک دن صبح کو ان کا فون میرے پاس آیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ''ان کے گھر آجاؤں'' میں نے پوچھا ''سب خیریت تو ہے'' انھوں نے جواب دیا ''نہیں''۔ میں امیر آغا کے مکان پر دل میں طرح طرح کے

خیالات لیے پہنچ گیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ انھوں نے سویرے سویرے مجھے بلایا ہے، مکان کی کال بیل کافی دیر تک بجاتا رہا مگر دروازے پر کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ میرے ذہن میں سو طرح کے شبہات نمودار ہوئے۔ میں نے دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ کافی دیر بعد امیر آغا نے دروازہ کھولا اس وقت ان پر نشہ اس قدر طاری تھا کہ وہ ٹھیک سے کھڑے نہیں ہو پارہے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میں نے بڑی مشکلوں سے انھیں صوفے پر بٹھایا اور پوچھا ''آخر کیا ہوا؟ آپ کیوں رو رہے ہیں۔'' انھوں نے کافی اصرار کرنے پر مجھے بتایا کہ ان کی فون سے امریکہ بات ہوئی تھی، خاتون وہیں بسنا چاہتی ہیں کچھ دنوں بعد وہ ہندستان آکر یہ فلیٹ فروخت کرنے والی ہیں۔ چونکہ انھوں نے اور خاتون نے مل کر خریدا تھا اور فلیٹ اسی کے نام ہے اس لیے اُس نے صاف طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ وہ اپنا بندوبست کہیں اور کرلیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں مگر وہ ان سے مسلسل بے وفائی کررہی ہے جس کے سبب وہ ٹوٹ چکے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا بھی خدشہ ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے کہ اس کو امریکہ میں کوئی اور مل گیا ہو جس کے سبب وہ بے وفائی پر اُتارو ہے؟ میں نے ان کو سمجھایا، نیبو پانی پلایا، فرج سے کھانا نکال کر کھلایا اور انھیں بستر پر لٹا کر واپس اپنے گھر چلا آیا۔ کچھ دنوں بعد میں نے سنا کہ وہ اپارٹمنٹس سے اپنے بھائی کے گھر سوئی والان، پرانی دلی منتقل ہوگئے ہیں۔ چونکہ ان کے بھائی کا مکان میں نے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہاں پہنچ کر ان سے ملاقات نہیں کرسکا لیکن ان کی طرف سے بے خبر، بھی نہیں رہا۔ پرانی دلی سے جو ادیب و شاعر ملتا تھا میں امیر آغا کی خیریت دریافت کرتا، سب نے یہی بتایا کہ انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح سے شراب کے حوالے کردیا ہے اور صبح سے لے کر شام تک مے نوشی میں مصروف ہیں۔ امیر آغا قزلباش کو حالات نے اتنے غم دیے کہ وہ ان کا بوجھ سنبھال نہیں سکے اور ان کا حساس ذہن شراب کے دامن میں پناہ تلاش کرنے پر مجبور ہوگیا۔ نئے رشتے بنانے کی دھن میں پرانے رشتے منقطع ہوتے چلے گئے مگر نئے رشتوں نے بھی ان کے ساتھ بے وفائی کی اور کچھ عارضی سہارے لمحوں میں ٹوٹ گئے، جس نے انھیں وقت سے پہلے موت کی آغوش میں دھکیل دیا۔

آج امیر آغا قزلباش ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر یہ بات بالکل سچ ہے کہ جب بھی دلّی کے بدمست رندوں کا ذکر ہوگا، اچھی اور معیاری شاعری کی کوئی تاریخ مرتب کی جائے گی اس میں جلی حروف میں سب سے چمکتا ہوا نمایاں نام امیر آغا قزلباش کا ہوگا۔

30-D, Block C-72, Nilgiri I,
Sector-34, Noida-201301

□□□

پانچ جدید مغربی ڈرامے

ترجمہ اور تعارف : زاہدہ زیدی

ان پانچوں ڈراموں کا شمار جدید مغربی تھیٹر کے اہم ترین فن پاروں میں ہوتا ہے۔ ہمہ گیر وژن، فنی ندرت اور گہری معنویت کے حامل یہ ڈرامے قبول عام کی سند حاصل کرچکے ہیں۔ ان کے مصنفین ہیں یوجین اونیکو، مینول دی پیدرولو، ژاں پال سارتر اور سیمول بیکٹ۔

(پہلا ایڈیشن)، صفحات: 406، قیمت: 126.00 روپے

اردو زبان کا جادو (حصہ اوّل، دوم)

مرتبین: مسز بی. شیاملا کماری

پروفیسر ماہ جبیں نجم

اردو سکھانے والی دو آسان کتابیں

جو تدریس زبان کے جدید سائنٹیفک اصولوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہیں۔ یہ کتابیں بچوں کے ساتھ ساتھ اردو سیکھنے والے بالغوں کے لیے بھی کارآمد ہیں۔

(حصہ اوّل، قیمت: 43 روپے)، (حصہ دوم، قیمت: 46.00 روپے)

''اردو دنیا'' اور ''فکر و تحقیق'' کے سالانہ خریدار بنیں

''اردو دنیا'' اردو کے حال اور مستقبل کا آئینہ ہے---خود بھی مطالعہ کریں اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں۔ سالانہ قیمت: 100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

ماضی کی علمی بازیافت اور حال کی علمی فتوحات سے واقفیت کے لیے **''فکر و تحقیق''** کا مطالعہ کریں۔ سالانہ قیمت: 100 روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں: (دہلی سے باہر کے لوگ -/110 روپے کا چیک بھیجیں)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

احمد بشیر

اللہ حافظ بنام خدا حافظ

ہم نے ترکی، اطالیہ، ہسپانیہ، یونان، اور دیگر ممالک میں اپنے دوستوں کو ٹیلی فون پر سالِ نو کی مبارک باد دی۔ گفتگو کے اختتام پر اطالیہ سے ہماری دوست نے ''آری ویدرچی (arrivederci)'' اور ترکی سے ہمارے دوست اور ان کی بیگم نے ''گلے گلے'' کہا۔ اسی طرح دوسرے دوستوں نے اپنی اپنی زبانوں میں ویسے ہی الوداع کہا جیسے وہ پہلے کرتے آئے تھے۔

ہم نے جب کراچی فون کیا تو بات چیت کے اختتام پر وہاں سے ''اللہ حافظ'' کی آواز آئی۔ کراچی میں ہی کسی اور کو فون کیا پھر اللہ حافظ، تیسرا فون اللہ حافظ۔ اس کے بعد لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد، کوہ مری، لاڑکانہ، غرض جہاں بھی فون کیا، ہمارے دوستوں اور رشتے داروں نے فون رکھنے سے پہلے ''اللہ حافظ'' کہا۔

ہم نے لندن، لندن کی نواحی بستیوں اور انگلستان کے دوسرے شہروں میں آباد پاکستانی احباب کو فون کیا۔ انھوں نے بھی بات چیت کا اختتام ''اللہ حافظ'' سے کیا۔

متحدہ عرب امارات کی ریاستوں، دبئی اور شارجہ سے ہمارے بھائیوں نے بھی ''اللہ حافظ'' ہی کہا۔

آخر میں ہم نے سوچا کیوں نہ کینیڈا اور امریکا میں آباد پاکستانیوں کو آزمایا جائے۔ مونٹریال، نیویارک، اور شکاگو سے بھی ''اللہ حافظ'' ہی کی صدا گونجی۔

میں گھبرا گیا، یا اللہ، اے خدا، یہ کیا ماجرا ہے؟ کہیں سلطنتِ پاکستان کی جانب سے کوئی فرمان تو نہیں جاری ہوا ہے جس کی خبر ہم جیسے نالائق لوگوں تک نہیں پہنچ پائی ہے؟ یا یہ کوئی دبا پھیلی ہوئی ہے، یا کوئی وائرس جس نے کوہ مری سے لے کر شکاگو تک پاکستانیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے؟

یا یہ کوئی شیعہ سنّی دشمنی ہے؟ ایران دشمنی ہے؟ یا پھر اردو دشمنی ہے؟ ہمیں نہیں معلوم، کیونکہ اب تک ہم سب پاکستانی رخصت ہوتے وقت ایک دوسرے کو ''خدا حافظ'' کہتے چلے آئے تھے۔

''اللہ'' عربی کے لفظ ''الٰہ'' سے ہے جس کا مطلب ''دیوتا'' ہے اور ''الاھۃ''، ''دیوی'' کو کہتے ہیں۔ ''اللہ'' دراصل ''واحد'' کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک اور صرف ایک ''الٰہ''۔ ''خدا'' فارسی کے لفظ ''خود'' سے ماخوذ ہے (جسے ہم اردو میں رات دن استعمال کرتے ہیں، یہ جانے بغیر کہ یہ فارسی کا لفظ ہے)۔ یعنی خدا خود اپنی ذات سے قائم ہے۔ قرآن میں بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کو کسی نے پیدا نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی پیدا ہوا ہے۔

اردو زبان عربی، سنسکرت، ہندی، فارسی اور ترکی زبانوں کی مرہونِ منت ہے، مگر سب سے زیادہ چھاپ اس پر فارسی کی ہے۔ بعد میں اس میں مغربی زبانوں کے الفاظ بھی داخل ہوئے ہیں۔ فارسی نے جو لطافت، حسن اور جمال فارسی نے اردو کو بخشا ہے، وہ کسی بھی اور زبان نے اردو کو عطا نہیں کیا۔ اگر آپ فارسی کو اردو زبان سے نکال دیں تو اردو کے دامن میں باقی کیا بچے گا۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں فارسی کا اتنا دخل ہے کہ اس کے بغیر ہم چل ہی نہیں سکتے اور وہ الفاظ جو ہم نے عربی کے لیے ہیں، ان میں سے بہت سے فارسی کے توسط سے آئے ہیں، اور ان کی شکل بدل گئی ہے۔ اصل میں جسے لسانیات کا شوق نہیں ہے اسے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ اس کی گفتگو، بول چال، تحریر و تقریر میں جتنے الفاظ ہوتے ہیں ان میں سب سے زیادہ فارسی کے ہوتے ہیں۔ فارسی ہمارے کلچر میں رچ بس گئی ہے۔ ہم صبح شام اپنی گفتگو میں فارسی کے محاورے اور امثال استعمال کرتے ہیں۔ ایک موقعے پر تو ہم نے فارسی محاورے کے استعمال سے انگریز تک کو محظوظ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ ہمارے تین چھوٹے بھائی لندن آئے ہوئے تھے۔ نصیر لیبیا سے آئے تھے۔ حفیظ پاکستان سے آئے تھے، اور سب سے چھوٹے سلیم متحدہ عرب امارات سے۔ ہم Bayswater کے ایک قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں دو انگریز ہماری میز پر آ کر بیٹھے۔ وہ دونوں بھائی تھے۔ ہم کھا پی چکے تھے۔ مجھے کافی کی مزید طلب ہوئی۔ میں نے سلیم کو پیسے دیے اور کہا ایک کافی لے کر آؤ۔ سلیم جیسے ہی کافی لے کر آئے حفیظ نے کہا کیک بہت لذیذ تھا۔ انھیں کیک کا ایک اور ٹکڑا چاہیے تھا۔ سلیم کو میں نے پھر رقم دی۔ جب وہ کیک لے کر آئے تو نصیر نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ایسپریسو کافی پینا چاہتے ہیں۔ سلیم پھر گئے۔ انگریز یہ سب تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان انگریز بھائیوں سے کہا کہ ہماری ثقافت میں چھوٹے بھائی کی حیثیت ''کتے'' کی سی ہوتی ہے۔ (یہ بیس بائیس برس پہلے کی بات ہے۔ وہ صورتِ حال اب عام طور پر نہیں ہے۔) میں نے انھیں فارسی کی یہ کہاوت سنائی ''سگ باش، برادرِ خورد مباش!''

میری توقع کے خلاف وہ دونوں بھائی بہت لطف اندوز ہوئے۔ خاص طور پر بڑے بھائی کی انا میں اضافہ ہوا۔ اس نے فوراً اپنے چھوٹے بھائی پر حکم صادر کیا، ''میرے ڈاگ، جاؤ۔ میرے لیے چائے لے کر آؤ!'' دوسرے دن ہم چاروں بھائی پھر اسی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ بڑے بھائی اکیلے ہی آئے۔ انھیں افسوس تھا کہ ان کا ''کتا'' ان کے ساتھ نہیں ہے۔ لہٰذا انھیں خورد و نوش کی اشیا کاؤنٹر سے خود لانا پڑیں گی۔ میرے لیے خوشی کی بات یہ تھی کہ اس نے ''ڈاگ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ یہ کہا کہ آج میرے ساتھ

میرا ''کتا''، میرا ''سگ'' نہیں ہے۔

اردو زبان عام طور پر اور شاعری خاص طور پر فارسی کی مقروض ہے۔ اردو میں نئی نئی تراکیب اور اصطلاحات فارسی پر مبنی ہیں، جن کے استعمال سے اس کی خوب صورتی میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

فیض احمد فیض کی مندرجہ ذیل تصانیف پر غور کیجیے: ''نقشِ فریادی''، ''دستِ صبا''، ''زنداں نامہ''، ''دستِ تہہِ سنگ''، ''سرِ وادیِ سینا''، ''شامِ شہرِ یاراں''، ''مرے دل مرے مسافر''، ''غبارِ ایّام'' ان میں ''نقش''، ''وادی''، ''سینا''، ''مسافر''، ''غبار'' اور ''ایام'' عربی کے الفاظ ہیں۔ باقی سب ''دل'' سمیت، فارسی کے ہیں۔ لیکن عرب ''وادیِ سینا'' اور ''غبارِ ایام'' نہیں لکھیں گے۔ یہ تراکیب بھی فارسی کی ہیں۔ ''متاعِ لوح وقلم'' میں الفاظ عربی کے ہیں لیکن ترکیب فارسی کی ہے۔ اس پر غور کیجیے، ''یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر'' یاد رہے کہ فیض نے انگریزی کے علاوہ فارسی میں نہیں بلکہ عربی میں ایم اے۔ کی سند حاصل کی تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں زیادہ استعمال فارسی کا کیا ہے۔ ''نسخہ ہائے وفا'' میں الفاظ اگرچہ عربی کے ہیں، ترکیب فارسی کی ہے۔

اگر آپ کو کسی وجہ سے فیض پسند نہیں ہیں تو پاکستان کے قومی شاعر علامہ اقبال کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، انھوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی ہے۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟\
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟\
سر آمد روزگار ایں فقیرے\
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

دردشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے\
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اور اردو میں کہتے ہیں:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی\
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق\
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

غور فرمائیے، اردو کے ان اشعار میں کتنے الفاظ فارسی کے ہیں۔

اگر آپ کو اقبال بھی پسند نہیں ہیں تو اسد اللہ خاں غالب کی شاعری پر نظر ڈالیے۔ انھوں نے بھی فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اشعار کہے ہیں۔ ان کی فارسی کو مشکل سمجھا جاتا ہے۔

نشنیدہ لذتِ تو فرو می رود بہ دل\
اے حرف، محوِ لعلِ شکر خای کیستی

(تمھارے اُن کہے الفاظ کی مٹھاس میرے دل میں سرایت کر گئی۔ اُن کہے اس لیے کہ تمھاری اپنی مٹھاس سے تمھارے لب محو گئے ہیں۔)

گردم ہلاک فرہ فرجامِ رہروی\
کاندر تلاشِ منزلِ عنقا شود ہلاک

(میں اس مسافر کے قابلِ ستائش انجام کو دیکھ کر خوشی سے مرا جا رہا ہوں جو عنقا کی منزل تلاش کرتے کرتے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔)

یہ تو غالب کے فارسی کے دو اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کی اردو کی شاعری میں بھی فارسی کا بہت عمل دخل ہے۔ غالب کے دیوان کا پہلا شعر دیکھیے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا\
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اور دوسرا شعر:

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ\
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اور یہ شعر:

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے\
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

چلیے چھوڑیے غالب، اقبال، فیض سبھی کو چھوڑیے۔ فارسی نکال دینے کے بعد پاکستان کے قومی ترانے کا کیا کیجیے گا؟

پاک سرزمین شاد باد\
کشورِ حسین شاد باد\
تو نشانِ عزمِ عالیشان\
ارضِ پاکستان\
مرکزِ یقین شاد باد\
پاک سرزمین کا نظام\
قوتِ اخوتِ عوام\
قوم، ملک، سلطنت\
پائندہ باد، تابندہ باد\
شاد باد منزلِ مراد\
پرچم ستارہ و ہلال\
رہبرِ ترقی و کمال\
ترجمانِ ماضی شانِ حال\
جانِ استقلال\
سایۂ خدائے ذوالجلال\
خدا حافظ

(بشکریہ ''دی اینول آف اردو اسٹڈیز'' 2004)

محمد مجیب (''ہندستانی مسلمان'' سے اقتباس)

ہندستانی مسلمان کون ہیں؟

وہ جو بھی ہوں اور ہندستان میں جہاں بھی ہوں خود ہندستانی مسلمان اپنے وجود کے متعلق کوئی شبہ نہیں رکھتے۔ یہ بات ہندستانی مسلمانوں کی تاریخ کے تمام ادوار پر صادق آتی ہے اور آج بھی موجود ہے جب کہ ملک کی تقسیم ایسی بنیاد پر کی گئی جسے تاریخ جائز ثابت نہیں کرتی۔ لیکن ہندستانی مسلمان اپنے وجود پر مختلف طریقوں سے یقین رکھتے ہیں اور وہ کیا ہیں اور کون ہیں اس کی مجمل تعریف بہت مشکل ہوجاتی ہے۔ مردم شماری نے تو یہ اصول پیش کیا کہ جو بھی ہندستانی ہے اور اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ ہندستانی مسلمان ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ ہندستانی مسلمان ہونے کے لیے کیا چیز ضروری ہے۔ افراد جن اصولوں کی بنیاد پر ملت کہلاتے ہیں ان میں سے ہم کسی بھی اصول کو کسوٹی بنائیں تو ہم اس مسئلے سے دوچار ہوں گے کہ عوام الناس کی ایک ایسی ملت ہمارے سامنے ہے جس کے اتحاد میں بہت سے اختلافات ہیں جن کی اہمیت کو ان کے تاریخی ارتقا کی روشنی ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ کتاب اس بات کی کوشش ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کی زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ پیش کیا جائے یعنی جب سے مسلمان ہندستان آئے اس تذکرے میں مکمل صحت کے لیے ضروری تھا کہ تقریباً بارہ صدیوں پر پھیلی ہوئی مدت کے مکمل ریکارڈ پر اسے استوار کیا جائے، لیکن ہمارے پاس جو کچھ وہ ہے سیاسی سرگرمیوں اور واقعات کے متعلق تذکرے اور خاص خاص زمانوں میں سیاحوں اور عینی شاہدوں کے بیانات، ہندستانی مسلمانوں کی پوری تاریخ کے دوران ان کے سماجیاتی ڈھانچے اور کردار کے متعلق نتائج اخذ کرنے کے لیے سیاسی تواریخ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتیں۔ سیاحوں اور شاہدوں کے بیان روشنی ضرور ڈالتے ہیں لیکن ان کی قدر و قیمت اسی زمانے کے لیے ہے، جن کے متعلق انھوں نے لکھا ہے اور زندگی کے ان پہلوؤں کے متعلق ہے جن میں ان مصنفین کو دل چسپی تھی۔ لیکن گذشتہ صدی کے اخیر اور موجودہ صدی کے ابتدا میں جو امپیریل گزیٹیر آف انڈیا کی تالیف ہوئی ان میں البتہ سارے ملک کے ہندستانی مسلمانوں کے متعلق معلومات ہیں۔ یہ معلومات ٹکڑوں ٹکڑوں میں ملتی ہیں۔ لازمی تھا کہ ڈسٹرکٹ گزیٹیر مختلف افسر ترتیب دیں۔ ان سب کا رجحان یکساں نہ تھا۔ کچھ میں جذبۂ مخالفت نمایاں ہے، کچھ پہلے ہی سے اپنے ذہن میں نتائج اخذ کیے نظر آتے ہیں۔ کچھ میں بددماغی نمایاں ہے۔ جو ان لوگوں کی فطرت میں ہوتی ہے جو اپنے آپ کو تہذیبی اعتبار سے اعلا تر سمجھتے ہیں لیکن گزیٹیر کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جامع ہیں اور ان سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندستانی مسلم کی زندگی کی پیچیدگیاں کیا ہیں، خاص طور پر ان کے عقائد اور عمل میں۔ ظاہر ہے اس کا تعلق اس زمانے سے ہے جب وہ لکھے گئے تھے ان سے کچھ اندازہ تعداد میں اضافے کے رجحانات اور تہذیبی ارتقا کا بھی ہوتا ہے جو مورخوں اور عصری زندگی کے طلبہ دونوں ہی کے لیے ایک مسئلہ ہیں۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں کا اپنی ملت یا برادری کو دیکھنے کا ایک خاص انداز ہے۔ تمام ملکوں میں اسلام نے شہری زندگی کو فروغ دیا اور ہر جگہ مسلم تہذیب بنیادی طور پر شہری تہذیب رہی ہے۔ لیکن جہاں بھی اسلام کی تبلیغ کی گئی وہاں مسلم معاشرے کے جڑ پکڑنے کی راہ میں یہ بات حائل نہیں ہوئی لیکن معیار زندگی اور تہذیب شہری رہی: مثالی اچھی زندگی ''انسانوں کے درمیان'' زندگی سے عبارت ہے یعنی ان آبادیوں میں عادات، پسند ناپسند اور حالات تہذیبی اور روحانی تجربے کے لیے خاصا موقع فراہم کرتے ہیں اس لیے تعلیم یافتہ مسلمان اپنی ملت کے متعلق یہ سمجھتے رہے کہ وہ شہروں کے رہنے والے ہیں اور اپنے آپ کو ایسے لوگوں میں شمار کرتے رہے جو شہری زندگی کا معیار قائم کرتے ہیں اور اس پر پورے بھی اترتے ہیں۔ دیہات کی غیر تعلیم یافتہ اور بے علم آبادی کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جس کی وہ اپنے وجود کی وجہ سے مستحق تھی اور یہ بات قابل فہم بھی ہے کیونکہ مسلمانوں نے مجلسی آداب، ادب اور آرٹ کو جو کچھ دیا ہے وہ شہروں ہی میں نظر آتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے ہندستانی مسلمانوں کے متعلق کوئی تحقیقی مطالعہ اس وقت تک معروضی نہیں ہوسکتا اور ظاہر ہے کہ ان کے متعلق معلومات مکمل نہیں ہوسکتیں جب تک ہم شہر اور دیہی دونوں آبادیوں کا مطالعہ نہ کریں۔

● چند مثالوں کو چھوڑ کر ہندستان کے مسلم مورخین نے ایسی معروضیت کی کبھی کوشش نہیں کی جس کی بدولت تاریخ کی بہتر سمجھ بوجھ پیدا ہوسکے۔ یہ کتاب ہندستانی مسلمانوں کو صحیح تاریخی تناظر میں دیکھنے کی کوشش ہے۔ اس کتاب کے مصنف محمد مجیب ہیں اور اس کا اردو ترجمہ محمد مہدی نے کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 812 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/258 روپے ہے۔

تو سب سے پہلے ہم امپیریل گزیٹیر سے مثالیں لے کر ان کی بنیاد پر اعتقادات میں تنوع کو دیکھیں۔ اس کے لیے ہم دہلی کو مرکز قرار دے کر یکے بعد دیگرے مختلف سمتوں میں جائیں گے۔

دہلی کے شمال میں کرنال کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں 1865 تک زراعت پیشہ مسلمان بڑی تعداد میں گاؤں کے پرانے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ حالانکہ مسلمان ہونے کے رشتے سے وہ کلمہ بھی پڑھتے تھے اور ان کے یہاں ختنے کی رسم بھی موجود تھی۔ پنجاب، صوبہ سرحد اور جموں کشمیر میں زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ لیکن بہت سے تعلیم یافتہ لوگ بھی توہم پرست تھے اور مشکل وقت پڑنے پر زندہ اور مردہ پیروں کے یہاں دوڑے جاتے تھے کہ ان کی مراد پوری ہو۔ روحانی اعتبار سے وہ کرامت اور جادو پر اتنا زیادہ انحصار کرتے تھے جس کا قادر مطلق خدا کے سچے تصور سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

دہلی کے شمال مغرب میں الور اور بھرت پور کی دیسی ریاستیں تھیں جہاں میو اور مینا رہتے تھے۔ ان کے نام خالص ہندوانہ تھے یا ہندو نام کے بعد خان کا لفظ جوڑ دیتے تھے۔ وہ صرف دیوالی اور دسہرہ ہی نہیں مناتے تھے جو حالانکہ ہندو تہوار تھے، لیکن ایک حد تک ان تہواروں نے قومی کردار حاصل کرلیا تھا بلکہ وہ سری کرشن کا یوم پیدائش جنم اشٹمی بھی مناتے تھے، اور اماوس کی رات سے پہلے جب چاند نہیں نظر آتا وہ تمام ہندوؤں کی طرح جسمانی محنت کرنے سے گریز کرتے تھے۔ جب وہ کنواں کھودنا چاہتے تو پہلے ایک چبوترہ بیرج یعنی ہنومان کے نام کا بناتے تھے۔ کلمہ بہت کم لوگوں کو آتا تھا۔ ان کی عبادت گاہیں 'پنج پیرا' بھمیا'، یا 'بھومیا' کہلاتی تھیں یا 'چاہنڈا'، 'پنج پیرا' ایک پتھر تھا جو ایک تالاب کے قریب نصب کیا جاتا تھا اور پانچ پیروں کے نام منسوب ہوتا تھا۔ 'بھمیا' ایک چبوترہ تھا جس پر پتھر رکھے جاتے تھے کہ وہ چراغ کی حفاظت کرسکیں اور یہ اس علاقے کی محافظ روح کے لیے مقدس تھا۔ 'چوہنڈا' بھی جسے کھیرا دیو بھی کہتے تھے ایک چبوترہ تھا جہاں مہادیوی کے حضور میں قربانیاں پیش کی جاتی تھیں۔ لیکن میو لوگوں کے مذہبی شعور میں جو بہادر یا نیم الوہی شخصیتیں سب سے بلند تھیں وہ تھیں:۔ سالار مسعود غازی جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سلطان محمد غوری کے ایک فوجی سالار کے بیٹے تھے، مدار صاحب کہ وہ بھی ایسا ہی اساطیری کردار رکھتے ہیں اور اجمیر کے خواجہ صاحب (یعنی خواجہ معین الدین چشتی) دوسرے مسلمان بھی ان پیروں کی زیارت کے لیے جاتے تھے لیکن میو لوگوں کی زندگی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ شب برأت میں ہر میو گاؤں میں سالار یعنی مسعود غازی کے جھنڈے کی پرستش کی جاتی تھی۔ مدار صاحب اور خواجہ صاحب کے سالاروں کی بھی اتنی ہی عزت کی جاتی تھی۔ ہندوؤں کی طرح میو بھی گوتر[1] کے اندر شادی نہیں کرتے تھے اور ان کی بیٹیوں کو ترکے میں کوئی حق نہیں ملتا تھا۔[2]

ان ہی کے ساتھ ایک قبیلہ مینا تھا ان میں دھریچا[3] کا رواج تھا۔ یہ لوگ شیو کے ایک روپ بھیروں کی اور ہنومان کی پوجا کرتے تھے اور کٹار[4] کی قسم کھاتے تھے۔ ریاست بوندی میں پہاڑ مینا رہتے تھے جو گائے اور سور کے گوشت کو حرام سمجھتے تھے۔ باقی دوسرے گوشت حلال تھے۔ شادی کے لیے اپنی لڑکی دینے پر انھیں پیسہ ملتا تھا۔[5] جاورا ریاست رتلام سے کوئی پچاس میل شمال میں ہے۔ یہاں کے مسلم کاشت کار شادیوں میں ہندو رسوم کی پابندی کرتے تھے۔ چیچک کی دیوی کو مانتے تھے اور شادی کے لیے لکڑی کا محراب گاڑتے تھے۔ جسے تورن کہتے تھے اس کے بیچ میں وہ لکڑی کا بنا ہوا ایک توتا رکھ دیتے تھے اور دروازے پر ٹل۔

احمد آباد کے شمال میں پالن پور کی ریاست تھی، یہاں ایک اور چیز نظر آتی تھی یعنی مہدوی لوگ۔ ان پر جو مظالم ہوئے ان کی وجہ سے یہ لوگ ایک گھٹی ہوئی بند برادری بننے پر مجبور ہوگئے۔ ان کے یہاں تقیہ جائز تھا۔ یعنی اپنے اعتقادات کو پوشیدہ رکھنا۔ یہ لوگ ظاہر کرتے تھے کہ ہم راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ حالانکہ ان کا اعتقاد تھا۔ چونکہ حضرت مہدی[6] کا ظہور ہو چکا ہے اس لیے اب گناہوں سے توبہ کرنے یا مردوں کی روحوں کے لیے دعا مانگنے کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ یہ لوگ دائروں یعنی حلقوں میں منظم تھے جن کے روحانی سربراہ سید کہلاتے تھے۔ یہ لوگ صرف اپنے اعتقاد والوں میں ہی شادیاں کرتے تھے۔ اس علاقے میں کولی، بھیل، سندھی اور ٹھاکر دار بھی رہتے تھے۔ یہ لوگ مسلمان تو ہوگئے تھے لیکن یہ بات انھیں نہ تو اپنے جرائم پیشہ کاموں سے الگ کرسکی اور نہ یہ لوگ قدیم باشندوں کے توہمات کو ترک کرسکے۔

ریگستان کے ادھر سندھ میں ایک طرف تو بہت ہی راسخ العقیدہ قسم کے لوگ تھے۔ جیسے سنی میمن تو دوسری طرف آبادی کی غالب اکثریت ضعیف الاعتقاد تھی۔ ان میں زندہ اور مردہ پیروں پر اور سیدوں پر بڑا اعتقاد پایا جاتا تھا اور ایسے اعمال موجود تھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ درختوں اور دریاؤں کی پرستش کی باقیات ہیں، بنیادی سندھی اعتقاد دو اصولوں پر مبنی ہے:۔ دریا میں مردانہ قوت افزائش ہے اور نیچر یا نباتات میں نسوانی قوت پیدائش، انھیں شیخ طبری یا طاہر پر اعتقاد تھا جن کے بارے میں وہ کہتے تھے کہ انھیں خدا اونٹ کی شکل میں دکھائی دیا تھا۔ ان کے مزار پہ خاص خاص موقعوں پر وہ مرد آتے تھے جن کی منگنی ہوچکی تھی اور وہ عورتیں جن کی شادی ہوچکی تھی۔ ہندو انھیں ادیرو لال کہتے تھے اور ان کا اعتقاد تھا کہ وہ ندی دیوتا کے اوتار ہیں اور مشکل وقت پڑنے پر اپنے لوگوں کو بچانے کے لیے مسلح سردار کے روپ میں ظاہر ہوتے

ہیں۔ دریائے سندھ پر اعتقاد یعنی دریا پنتھ ایک سیدھی سادی رسم تھی جو خاص طور پر سندھی لوہانہ میں پائی جاتی تھی۔ اس دیوتا کو مخاطب کرتے وقت کہتے تھے 'لہروں کے مالک ہماری دعا قبول کر' سکھر میں دریا کی پرستش نے خواجہ خضر کی پرستش کی شکل اختیار کرلی اور ٹھٹھ میں شاہ جھنڈو کی جو جان بچانے والے ملاح سمجھے جاتے تھے۔ مگرمچھ کی پرستش ہوتی تھی۔ عام طور پر اس کا تعلق پیر پرستی سے تھا۔ نباتات کی پرستش کا قریبی تعلق کئی طرح سے عورت سے تھا۔ ٹھٹھ اور میرپور سکرو کے درمیان پیر جھاڑیوں کی پرستش کا مرکزی مقام تھا۔ یہ ایک رسم تانیث ہے۔ جس کا مطلب ہے درخت، پیر کی خلیفہ ہمیشہ، ہنگوزہ قبیلے کی عورت ہوتی تھی۔ آج جو دیہہ جھاڑیوں ہے اس کے حدود کے باہر گھوربری ضلع میں اس کی ایک آزادانہ شکل ملتی ہے۔ رچھال دریا کے قریب مائی پیر یعنی ماں پیر کا مزار تھا۔ یہ مزار مٹی کی نیچی منڈیر کے حلقے میں جس کا قطر کوئی سو گز تھا ایک جھاڑی کے اندر تھا اس کے اندر کسی مرد کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ مائی پیر کنواری تھیں۔ مزار ایک معمولی سی کٹیا تھی، جس کی چھت سے مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں لٹکی ہوئی تھیں۔[7]

ان کے علاوہ سندھ میں اور بہت سے اعتقادی حلقے تھے۔ کچھ اعتدال پسند اور کچھ عام اعتقاد سے بالکل ہی الگ پنجابی برادری کے اسماعیلی خوجے آغا خان کو ماننے والے تھے یہ لوگ حضرت علی کو وشنو کا دسواں اوتار سمجھتے تھے۔ زکوٰۃ کی رقم آغا خان کو دیتے تھے جو غائب امام تھے، یہ لوگ قرآن کے بجائے ایک ایسی کتاب پڑھتے تھے جو ان کے ایک پیر صدرالدین نے تالیف کی تھی۔ ان کی دعاؤں میں ہندو اور اسلامی اصطلاحات ملی ہوئی تھیں۔ اسماعیلیوں کا ایک فرقہ تھا پیرائی۔ انھوں نے آغا خان کی پیروی ترک کردی تھی۔ ان لوگوں میں پیدائش، شادی اور موت کے موقعے پر ہندو رسمیں ہوتی تھیں، ذکری یا دائی قرآن پڑھتے تھے لیکن کہتے تھے کہ رسول کے احکام حضرت مہدی نے منسوخ کردیے ہیں اور ہم مہدی کو مانتے ہیں۔ یہ لوگ نہ نماز پڑھتے تھے نہ روزہ رکھتے تھے لیکن ہر جمعہ کو ذکر کرنے ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنے ملاؤں کی عزت پرستش کی حد تک کرتے تھے۔ خدرا فرقے کے لوگ عورتوں کی طرح لباس پہنتے تھے اپنے کو فقیر کہتے تھے اور بکھراسر دیوی یا دیول دیوی کی پوجا کرتے تھے اس دیوی کی مورت جس جگہ رکھی جاتی تھی اسے مستری کہتے تھے اور اس کو آٹے، شکر اور گھی کے ملیدے کا بھوگ چڑھایا جاتا تھا۔[8] بلوچستان کے مکران علاقے میں جو حضرت مہدی کے پیرو ذکری اور دائی تھے انھوں نے اپنا کعبہ تربت کے پاس کوہ مراد پر بنالیا تھا اور وہ اسی زمانے میں وہاں حج کے لیے جاتے تھے جب عام مسلمان، مکہ حج کے لیے جاتے ہیں۔[9]

دہلی کے مشرق میں جس علاقے کو اب اتر پردیش کہا جاتا ہے اور بہار کے وسطی علاقے میں گنگا کے جنوب میں کئی فرقے تھے جن میں بہت اختلافات تھے یہاں زندہ اور مردہ پیروں کی کرامات پر بہت اعتقاد تھا۔ کچھ علاقوں میں خاصی بڑی تعداد میں 'نومسلم' فرقے تھے جنھوں نے بس ایک حد تک مذہب تبدیل کیا تھا پیروں کے مزاروں پر بے شمار عرس تو ہوتے ہی تھے لیکن ہم یہاں منیر تالاب کے گرد ہونے والے غازی میاں کے میلے کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بات راسخ العقیدگی سے کتنی دور جا پہنچی تھی۔ یہاں گرمیوں کے موسم میں جھوٹ موٹ کی شادی کا ایک جلوس آبادی سے نکلتا تھا جس میں گانا بجانا ہوتا تھا اور لوگ غازی میاں کا جھنڈا لے کر تالاب کی طرف آتے تھے اس جھوٹ موٹ کی شادی کی دلہن اور دولہا کے والدین کے فرائض ہجڑے ادا کرتے تھے۔ تالاب کے قریب ایک ٹیلے پر ایک مزار تھا جہاں وہ عورتیں اور لڑکیاں لائی جاتی تھیں جن پر بدروحوں کا سایہ ہوتا تھا۔ ان کو یہاں حال آتا تھا اور جوش جنون میں ناچنے لگتی تھیں اس میلے کے موقعے پر تاڑی خوب پی جاتی تھی[10] لیکن اسے اعتقاد کا اظہار کہنے سے زیادہ صحیح ہوگا عوامی سطح پر تحریف کہنا۔

گنگا کے شمال میں پورنیا میں تعلیم یافتہ اور راسخ العقیدہ مسلمان تو رہتے ہی تھے لیکن نیچے طبقے کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اعتقادات اور عمل کے درمیان فرق اگر تھا بھی تو بہت باریک۔ ہر گاؤں میں ایک کالی استھان تھا جہاں کالی کی پوجا ہوتی تھی اور تقریباً ہر مسلمان گھر میں ایک چھوٹی سی جگہ ہوتی تھی جسے خدائی گھر کہتے تھے یہاں جو عبادت ہوتی تھی اس میں اللہ اور کالی دونوں کے نام لیے جاتے تھے۔ مسلمانوں کی شادی کی رسم بھگوتی دیوی کے دیول میں ادا کی جاتی تھی بکرے، مرغی، کبوتر اور درختوں کے پہلے پھل اور ترکاریاں خالص ہندو دیوی دیوتاؤں کو چڑھائی جاتی تھیں، خاص طور پر گاؤں کی دیوی یا دیوتا کو جس کے بارے میں خیال تھا کہ سب سے آرام دہ درخت پر اس کا بسیرا ہوتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں سب سے مقبول دیوتا کا نام تھا، دیوتا مہاراج، اس کے دربان کا نام تھا، ہادی اس کا استھان اور پوجا کی جگہ صرف ایک بانس تھا جسے زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اس سے ایک پرانا سوپ، ایک کمان، مچھلی پکڑنے کا ایک پرانا جال اور ایک کانٹا لٹکا دیا جاتا تھا۔ کشن گنج سب ڈویژن میں مسلمانوں کی ایک، بنگالی، ذیلی ذات رہتی تھی۔ یہ لوگ ہندو دیوی دیوتاؤں کے لیے خاص طور پر ناگ دیوی جیشا باری کے لیے مندر بناتے تھے۔ اس کا جواز ان کے پاس یہ تھا کہ ہمارے پرکھوں کے پاس خدا کا گھر اور جیشا

باری مائی کا گھر دونوں ہوا کرتے تھے۔[11]

جوبیس پرگنہ کے سب ڈویژنوں بارات اور بشیرہاٹ میں مسلمان لکڑہارے اور مچھیرے موبراہ (مبارک) غازی کو مانتے تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ وہ ایک فقیر تھے جنھوں نے جنگل کے سارے درندوں کو اپنے قابو میں کرلیا تھا اور وہ خود شیر کی سواری کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس علاقے کے زمیندار یا راجہ نے حکم دیا کہ ہر گاؤں میں ان کے نام کی ایک عبادت گاہ ہو۔ سندربن کے آس پاس کے گاؤں میں ایسی عبادت گاہیں عام تھیں۔ اور موبراہ غازی سے حفاظت کی دعا مانگے بغیر لکڑہارے کبھی جنگل کا رخ نہیں کرتے تھے، اس عبادت کی ایک خاص رسم تھی جو وہی فقیر ادا کرتے تھے جو اپنے کو غازی کی اولاد کہتے تھے۔ لکڑہاروں کو جہاں کام کرنا ہوتا تھا وہاں فقیر ان کے ساتھ جاتا تھا۔ جنگل کا ایک حصہ صاف کرکے اور ایک دائرہ بنا کر وہ کچھ دعا پڑھتا تھا اس دائرے میں وہ کھونٹوں اور پتوں سے سات چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بناتا تھا۔ پہلی کٹیا جگ بندھو (دنیا کے دوست) کے نام سے منسوب کی جاتی تھی۔ دوسری مہادیو کے نام جو، وناش، تباہی کے دیوتا تھے، تیسری سانپوں کی دیوی مناسا کے نام سے۔ اس کے قریب ایک چھوٹا سا چبوترہ جنگل کی ایک روح روپاپری کے نام بنایا جاتا تھا اور اس کے بعد چوتھی کٹیا بنائی جاتی تھی۔ اس میں دو کمرے ہوتے تھے۔ ایک کالی کے لیے اور دوسرا اس کی بیٹی کالی میا کے لیے اس کے بعد پھر ایک چبوترہ ہوتا تھا جس پر جنگل کی ایک پروں والی روح اور پری کو بھوگ چڑھایا جاتا تھا اس کے بعد ایک اور کٹیا بنتی تھی جس میں دو کمرے ہوتے تھے ایک کامیشوری کے لیے اور دوسرا بوڑھی ٹھکرانی کے لیے۔ اس کے بعد ایک پیڑ ہوتا تھا جسے رکشیا چنڈی کہتے تھے۔ (یہ کالی کا دوسرا نام تھا) اس کے تنے پر سیندور لگایا جاتا تھا۔ لیکن اسے کوئی بھینٹ نہیں چڑھائی جاتی تھی۔ اس کے بعد چھٹی اور ساتویں کٹیائیں بنائی جاتی تھیں جن کے اوپر جھنڈیاں لہراتی تھیں۔ دونوں میں دو دو کمرے ہوتے تھے۔ پہلا غازی صاحب (مبارک غازی) اور ان کے بھائی کالو کے نام اور دوسرا ان کے بیٹے چاول پیر اور ان کے بھتیجے رام غازی کے نام منسوب ہوتے تھے۔ آخری دیوتا جسے خوش کیا جاتا تھا وہ تھا بستو دیوتا (دھرتی) جس کے لیے کوئی کٹیا یا چبوترہ نہیں بنایا جاتا تھا۔ ان کے لیے بھینٹ زمین پر کیلے کے پتوں پر چڑھائی جاتی تھی جب سب کچھ تیار ہو جاتا تھا تو فقیر غسل کرتا تھا اور دھوتی باندھتا تھا جو اسے لکڑہارے دیتے تھے اور اپنے ہاتھوں اور ماتھے پر سیندور ملتا تھا۔ پھر اپنے منہ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل جھکتا تھا زمین پر سجدہ کرتا تھا اور اس طرح ہر دیوتا کے سامنے چند سیکنڈ تک رہتا تھا اور ان سے دعا مانگتا تھا۔[12]

چٹاگانگ ضلع میں ہندو اور مسلمان دونوں ملاّح اپنے محافظ دیوتا کے روپ میں پیر بدر کو مانتے تھے۔ جب یہ لوگ سمندر یا دریا کے سفر پر روانہ ہونے پر ایک دعا پڑھتے تھے "ہم تو ہیں بچے، غازی ہمارے محافظ ہیں، گنگا ہمارے سر پر ہے۔ او پانچ پیر! او بدر، بدر، بدر!" خیال ہے کہ پیر بدر اور خواجہ خضر ایک ہی ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سمندروں اور دریاؤں میں رہتے ہیں اور ملاّحوں کی کشتیاں ڈوبنے سے بچاتے ہیں۔[13]

دہلی کے جنوب میں وسطی ہندستان میں اندور کے آس پاس مسلم پٹیل اور مردھا[14] ہندو نام رکھتے تھے۔ ہندوؤں ہی کی طرح کپڑے پہنتے تھے اور کچھ لوگ بھوانی اور دوسرے ہندو دیوتاؤں کو مانتے تھے۔ گجرانہ میں ایک دیہی آبادی تھی ناتیا۔ شہر کے مسلمان انھیں نیچ ذات کہتے تھے۔ یہ پنڈاری لٹیروں اور ان قیدیوں کی نسل سے تھے جنھیں انھوں نے مسلمان کرلیا تھا۔ یہ لوگ مکمل طور پر اپنے ہندو پڑوسیوں میں گھل مل گئے تھے۔[15]

ایسا لگتا ہے کہ گجرات ایک ایسی ہانڈی تھی جس میں مختلف نسلوں کے لوگ اور مختلف عقائد آکر ایک دوسرے میں مدغم ہوگئے تھے۔ یہ کہنا تو صحیح نہ ہوگا کہ مختلف پیانوں کی ضعیف الاعتقادی گجراتی مسلمانوں کا طرّہ امتیاز تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہاں وہ ایسی شکلوں میں پائی جاتی تھی جیسی کسی اور علاقے میں نہیں۔ خوجوں اور مہدویوں (یا جیسا انھیں غیر مہدوی بھی کہا جاتا تھا) کے علاوہ جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے ایسے دوسرے قبائلی یا عقائد پر مبنی گروہ تھے جن کے عقائد اور رسوم کو اسلامی چوکھٹے میں بٹھانا مشکل تھا۔ قبائلی گروہ میں سب سے نمایاں سدّی، مولسلام، قصباتی، راٹھوڑ اور گھانچی تھے۔ عقائد پر مبنی جو گروہ تھے ان میں حسینی برہمن، مداری، شیخ داس یا شیخ اور کمالے تھے۔

سدّی ان افریقیوں کی اولاد میں سے تھے جنھیں زیادہ تر سومالی لینڈ سے غلام بنا کر لایا گیا تھا۔ ان میں پیشہ ور گویّے اور رقّاص تھے جو اپنے سازوں یعنی جھنجھنے اور ڈھول کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جھنجھنا ماما (ماں) مسراہ کے لیے متبرک تھا اور ڈھول فادر گھر کے لیے۔ سمجھا جاتا تھا کہ اگر کوئی شخص ناپاکی کی حالت میں ان سازوں کو ہاتھ لگاتا ہے تو دیوتا اسے سزا دیتے ہیں۔ مولسلام، راٹھوڑ اور قصباتی راجپوتی قبائل کے حصے تھے جنھوں نے نیا مذہب تو قبول کرلیا تھا لیکن جہاں تک ممکن تھا اپنے پرانے عقائد اور رسوم کی بہت کم چیزیں انھوں نے ترک کی تھیں۔ مولسلام نہ صرف ہندو تہوار ہی مناتے تھے بلکہ ہندو دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی کرتے تھے۔[17] راٹھوڑ اپنے آپ کو سنّی کہتے تھے لیکن نہ تو نماز پڑھتے تھے نہ قرآن۔ ان میں کچھ اپنے گھروں میں سوامی نارائن کی تصویر رکھتے تھے۔ اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے یہاں ہندو مسلمانوں میں آپس میں شادیاں ہوتی تھیں یہ بات قصباتیوں میں

بھی موجود تھی۔[18] کھانچی زیادہ تر پنچ محل (گودھرا) میں پائے جاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو کسی منصور کا پیرو کہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ دوسرے تمام مسلمانوں سے کمتر کھاتے تھے اور ہندوؤں کو اچھا سمجھتے تھے۔[19]

اعتقادی گروہوں میں حسینی برہمن اپنے آپ کو اتھروید کا پیرو کہتے تھے اور اپنے نام کی وجہ تسمیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے امام حسین کو بتاتے تھے۔ غالبًا ان لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا بلکہ کچھ ایسے اسلامی عقائد اور اعمال انھوں نے اختیار کرلیے تھے جنھیں ہندو دھرم کے منافی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ گائے کو چھوڑ کر یہ لوگ ہر قسم کا گوشت کھاتے تھے مگر چھپ کر۔ ان کے مرد مسلمانوں کی طرح لباس پہنتے تھے لیکن ماتھے پر تلک لگاتے تھے۔ ان میں ختنے کا رواج نہیں تھا۔ ان کی شادیاں خود ان کے پروہت کراتے تھے اور یہ لوگ اپنے مردوں کو بیٹھی شکل میں دفن کرتے تھے اسی کے ساتھ یہ لوگ رمضان میں روزے رکھتے تھے اور دوسری مسلم رسمیں بھی ادا کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین اجمیری کی یہ لوگ خاص طور پر بہت عزت کرتے تھے مداری اپنے آپ کو کنوارے پیر بدیع الدین مدار شاہ کا پیرو بتاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے پیر کانپور کے قریب مکن پور کے مقام پر اپنے مزار میں اب تک زندہ ہیں۔ یہ لوگ مسلمان صوفیوں کے علاوہ ہندو دیوی دیوتاؤں کو بھی مانتے تھے۔

شیخ داس یا شیخ احمد آباد کے قریب ایک مقام پیرانہ میں دفن ایک چھوٹے سے پیر بالا محمد شاہ کو مانتے تھے۔ ان کے یہاں ختنے کا رواج نہیں تھا۔ ماتھے پر یہ لوگ تلک لگاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ ان میں سے بہتوں کا تعلق سوامی نارائن فرقے سے تھا۔ لیکن شادی بیاہ میں ہندو اور اسلامی دونوں رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے لیے ایک فقیر اور ایک برہمن کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ اپنے مُردوں کو مسلمانوں کی طرح دفن کرتے تھے۔

کمالیوں کے متعلق مراۃ الاحمدی میں ہے:۔ ''احمد آباد کے شمال میں چالیس میل کے فاصلے پر چنول کے سب ڈسٹرکٹ میں پٹن کے تحت ایک گاؤں سن خان پور میں ایک مندر ہے جس میں کوئی مورتی نہیں ہے لیکن ایک طاق ہے جو بہوچارا کے نام سے منسوب ہے یہ بھوانی دیوی کے کئی ناموں میں سے ایک ہے پرستش کرنے والے دو طبقوں میں تقسیم ہیں۔ پاڈیا (ہجڑے) اور کمالیے۔ کمالیے فوجی پیشہ کرتے ہیں اور بہوچارا کا نشان جو کہ ترشول ہے ہمیشہ ان کے پاس رہتا ہے۔ یہ دونوں ہی مسلمان ہیں۔ یہ لوگ بہوچارا کے مندر میں بھینسے کی قربانی دیتے ہیں اور اس کے خون سے ماتھے پر ٹیکا لگاتے ہیں۔'' ان کے یہاں ختنے کا رواج نہیں تھا اور سوا اس کے کہ وہ اپنے مُردوں کو دفن کرتے (ان کے سینوں کو داغنے کے بعد) ان کی باقی تمام رسمیں ہندوؤں کی تھیں۔[20] یہ تمام اعتقادی فرقے کسی نہ کسی شکل میں بھیک مانگنے کو اپنا پیشہ سمجھتے تھے۔

کچھ کے مومنا کہتے تھے کہ ہم شیعہ ہیں لیکن اپنی عادات میں، محسوسات میں اور سوچنے کے انداز میں وہ بالکل ہندوؤں کی طرح تھے یہ لوگ مسلمانوں سے گھلتے ملتے نہیں تھے، گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ان میں ختنے کا رواج نہیں تھا۔ یہ لوگ نہ پانچ وقت نماز پڑھتے تھے نہ رمضان میں روزے رکھتے تھے۔ بچّے کی پیدائش کے چھٹے دن وہ زمین پر گلال سے ایک صلیب بناتے تھے اور ایک مہینے کے بعد ایک سارسوت برہمن کو بچے کا نام رکھنے کے لیے بلاتے تھے۔[21] بھدالا لوگوں میں دریا کے دیوتا کی قسم کھانے کی رسم تھی یہ لوگ اپنے کو سُنّی کہتے تھے۔[22]

ضلع نیمار میں ایک فرقہ پیر زادہ کہلاتا تھا جن کا مرکز برہان پور تھا۔ کوئی ڈھائی سو برس پہلے ایک پیر محمد شاہ دُلّا نے اسے قائم کیا تھا۔ انھوں نے سب سے بڑے دیوتا کے روپ میں وشنو کے دسویں اوتار کو قبول کیا جن کا ظہور ہونا ہے اور جنھیں یہ لوگ نش کلنکی یعنی معصوم کہتے تھے وہ وشنو کو اس کے تمام اوتاروں کے روپ میں مانتے تھے۔ لیکن باقی، اور ہندو دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتے تھے۔ بہت سے ہندو خاص طور پر کنبی اور گوجران کے مرید ہوگئے لیکن انھیں اجازت تھی کہ وہ اپنی اپنی جات میں برقرار رہیں اور اپنی جات کے قوانین پر عمل کریں۔ اس فرقے کے سربراہ یعنی محمد شاہ کے روحانی جانشین ان کے مزار پر ہر سال ایک اجتماع کی سربراہی کرتے تھے۔ انھوں نے ایک کتاب تالیف کی تھی جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مذہبی تصانیف سے کچھ چیزیں لے کر جمع کر دی گئی تھیں اور یہی ان کی مذہبی کتاب تھی۔ ان کے جانشین اپنے آپ کو کٹر مسلمان کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم نے کبھی نش کلنکی پر یقین نہیں رکھا وہ بھی اعتراف کرتے تھے کہ ہمارے پیرو بہر حال ہندو ہیں۔[23]

پہلے جس علاقے کو صوبہ متوسط اور برار کہا جاتا تھا وہاں کے دیہی علاقوں اور تھانہ احمد نگر اور بیجاپور کے اضلاع کے مسلمانوں کے متعلق عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ تین چوتھائی ہندو تھے۔ مسلمان پہنے یعنی روئی دھنکنے والے کھانے کے لیے مرغ کو جس طرح ذبح کرتے تھے وہ واقعی مقررہ طریقے کا مذاق تھا، ذبح کرتے وقت وہ کہتے تھے ''باپ اور بیٹے، شیخ فرید اللہ مرغ کو ذبح کرو۔ خدا کا حکم ہے کہ مرغ میرے ہاتھ سے مرے'' بالکل اسی

طرح انڈے کو بھی ذبح کیا جاتا تھا۔ انڈے کے اوپر کا چھلکا توڑتے وقت بہنا کہتا تھا۔

''سفید گنبد جس میں نمی ہی نمی ہے، مجھے معلوم نہیں تیرے اندر نر ہے یا مادہ، اللہ کے نام پر تجھے ذبح کرتا ہوں۔''[24]

'بلدانہ کے کچھ دیش مکھ اور دیش پانڈے مذہباً مسلمان تھے۔ اور اپنے پرانے محافظ دیوتاؤں کی پوجا کے لیے خفیہ طور پر برہمنوں کو بلاتے تھے۔'[25] احمد نگر اور بیجاپور اور تھانہ کے قصائیوں میں شدید ہندو رجحانات تھے۔ یہ لوگ گائے کا گوشت کھانے سے اتنی نفرت کرتے تھے کہ گائے ذبح کرنے والے کو ہاتھ تک نہیں لگاتے تھے اور مسلمانوں سے عام طور پر ملنے سے احتراز کرتے تھے حالانکہ شادی بیاہ اور موت کے موقعے پر قاضی کو بلاتے تھے۔ احمد نگر میں قصائی یا بقر قصاب اور پنجارے اب تک ہندو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے اور اپنے گھروں میں ان کی مورتیاں رکھتے تھے۔[26] بیجاپور میں ان دو فرقوں کے علاوہ باغبان، کنجڑ، چڑی مار، رسی بنانے والے اینڈھرا اور گھسیارے حالانکہ اپنے کو مسلمان کہتے تھے لیکن ہندوؤں کی طرف ان کا جھکاؤ اتنا زیادہ تھا کہ یہ لوگ مسلمانوں سے ربط ضبط نہیں رکھتے تھے اور کھلم کھلا ہندو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے چھپر بند جو پہلے قزاق تھے حالانکہ مسلمان ہو گئے تھے لیکن پھر بھی ہندو دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔

جنوبی ہندستان البتہ ایک مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ یہاں اسلام براہِ راست عرب سے عرب تاجروں کے ذریعے آیا اور اعتقاد کے معاملات میں مسلمان اپنے آس پاس کے ماحول سے متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن دوسری طرف لباس، غذا، طور طریقوں اور رسوم اور قانون وراثت میں یہ لوگ بڑی حد تک غیر مسلموں میں مدغم ہو گئے، خاص طور پر سمندر کے ساحلی علاقے میں۔ ظاہر ہے جنوب کوئی یک رنگ اکائی نہیں ہے۔ مثلاً میسور اور بنگلور کے مسلمان تہذیبی اعتبار سے حیدرآباد کے مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں نہ کہ کیرلا کے موپلا اور نوئت کے جو جغرافیائی اعتبار سے ان سے قریب ہیں۔ لیکن فرق آداب و رسوم میں ہے، عقائد میں نہیں جس سے ہم بعد میں بحث کریں گے۔

یہ چند مثالیں تھیں زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد کی اور ان میں بھی زیادہ تر دیہی علاقوں کے نچلے طبقوں کی انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں۔ اس تصویر کو کسی بھی طرح مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں سنّی حنفی شامل نہیں ہیں۔ جن کی شہروں میں بھاری اکثریت تھی اور جو زمین کے مالک تھے۔ اسی طرح ان میں دوسرے سنّی اور شیعہ فرقوں کے لوگ شامل نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک دو صدی پہلے جو صحیح حالات تھے، ان کی یہ تصویر نمائندگی نہ کرتی ہو، ہوسکتا ہے کہ موجودہ صدی میں حالات بدل چکے ہوں اور اب جو گزیٹیر تیار ہو رہے ہیں وہ ان ہی طبقوں اور علاقوں کے مسلمانوں کی مختلف تصویر پیش کریں ہم اپنی بحث کے اس حصے کو ایک خبر پر ختم کرتے ہیں جو 11 مارچ 1959 کو اخبار ''اسٹیٹس مین'' میں شائع ہوئی تھی۔

''راجستھان میں سورت گڑھ کے قریب ایک ہندو مندر ہے جس کا پجاری مسلمان ہے جو مورتی کی پوجا کراتا ہے اور شردھالو جو بھینٹ چڑھاتے ہیں اسے وصول کرتا ہے۔ یہ سلسلہ کئی نسلوں سے چلا آرہا ہے۔''

''یہ مندر گھوگھا میڑی میں ہے جس میں ایک راجپوت سنت گھوگھا جی کی مورتی نصب ہے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ اپنی زندگی میں انھوں نے بہت سے چمتکار دکھائے تھے۔''

''مسٹر مرلی دھر ویاس کو جنھوں نے ریاستی اسمبلی میں یہ سوال اٹھایا تھا آج مندروں سے متعلقہ وزیر مسٹر دامودر ویاس نے بتایا کہ مسٹر رام رتن سنگھ چوہان نے 1951 میں حکومت کو درخواست دی تھی کہ جو مندر میرے پرکھوں کے نام سے منسوب ہے اس میں پجاریوں کے طور پر کام کرنے کا حق مسلمان خاندانوں کو نہیں ہے اور یہ حق مجھے پہنچتا ہے۔ وزیر موصوف نے بتایا کہ تحقیقات کے بعد حکومت نے مسلمان خاندان کے حق کو جائز قرار دیا ہے۔''

جو موٹا سا خاکہ ہم نے پیش کیا ہے اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے کہ ہندستانی اسلام کی اپنی شکل نہیں تھی حالانکہ عقائدوں کی درجہ بندی کرنے میں سہل انگاری کے خلاف یہ ایک دلیل ضرور ہے۔ بنیادی طور پر اس سے نظر آتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کا ایک سلسلہ رہا ہے جو صدیوں سے جاری ہے۔ ایک مذہبی فرقے کی حیثیت سے ہندستانی مسلمانوں کی مسلسل تشکیل ہوتی رہی ہے اور اب بھی جاری ہے۔

سماجی اشکال میں بھی تنوع نظر آتا ہے۔ جب مسلمان — عرب اور ترک پہلے پہلے ہندستان آئے تو انھوں نے تاثر یہ پیدا کیا ہوگا کہ وہ گٹھی ہوئی مساوات پر قائم ایک برادری ہیں۔ جب دہلی سلطنت قائم ہوگئی اور سیاسی پالیسی وہ فیصلہ کن عنصر بن گئی جو یہ طے کرتی تھی کہ براہِ راست مسلمان حکمراں گروہوں اور طبقوں کے درمیان آپس میں اور بالواسطہ طور پر ان سے متعلقہ حلقوں کے درمیان تعلقات کیا ہوں گے تب بھی اس اصول کو نہ کبھی مسترد کیا گیا نہ کھلم کھلا اس کو چیلنج کیا گیا کہ سب مسلمان برابر ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ ایسے کاروبار اور پیشے تھے جو بذات خود گھٹیا نہیں تھے لیکن ہندو سماج ان کو حقارت سے دیکھتا تھا اور تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے یہ پیشے اختیار کرنے والی برادریوں نے وہ درجہ حاصل کرلیا جو کسی اور طریقے سے وہ

حاصل ہی نہیں کرسکتی تھیں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ہمیں وہ جانا پہچانا فرق نظر آتا ہے جو سید، شیخ (یعنی ایسا شخص یا خاندان جو عرب نژاد تو تھا لیکن جس کا تعلق براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد حضرت علی کے خاندان سے نہیں تھا۔) مغل (ترک) اور پٹھان کے درمیان ہے۔ وہ خاندان جو متمول ہوگئے یا متمول برادریاں جنھوں نے مذہب تبدیل کرلیا اور مسلمان ہوگئیں لیکن جو نسلی اعتبار سے معمولی تھیں ان سب نے تاریخی طوطا مینا اڑا کر اپنے کو ان چاروں نسلی گروہوں میں داخل کرلیا۔ لیکن انھوں نے اپنا امتیاز باقی رکھا۔ اکثر و بیشتر وہ خود اسی برادری کے دوسرے خاندانوں کے ساتھ شادیاں کرنے سے گریز کرتے تھے۔ ان لوگوں میں خاندان کی نجابت برقرار رکھنا ہمیشہ سے ایک اہم سوال رہا ہے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ تمھارا تعلق ''طبقہ اشرفیہ'' سے ہے اور ان کے اس رویہ کو شرافت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ جن لوگوں کا تعلق نچلے طبقوں کی برادریوں سے تھا وہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان تصورات کو ترک نہیں کرتے تھے اور نہ ان سے باہر نکل پاتے تھے جو انھیں اپنی جات سے وراثت میں ملے تھے کبھی کبھی تو یہ لوگ جات کے فرق پر بہ ضد قائم رہتے تھے۔ ہم ایسی مسلم برادریوں کا ذکر کر چکے ہیں جو دوسرے مسلمانوں سے میل جول بڑھانے سے احتراز کرتی تھیں لیکن تقریباً سارے ملک میں اوپری طبقے متحد کرنے کا عنصر رہے ہیں چاہے ان کا تعلق چاروں نسلی گروہوں میں سے کسی سے بھی ہو اور ہم نے جس لاغیریت پسندی کا ذکر کیا ہے وہ مقامی ہے، غیر معمولی ہے جس کی بہت زیادہ اہمیت نہیں۔ مسلمان عام طور پر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں یا انھیں تسلیم کرایا جاسکتا ہے کہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا ان کا فرض ہے۔ صرف مسجد کی نماز ہی نے نہیں شادی کی دعوت تک نے امیروں اور غریبوں، 'اعلیٰ اور معمولی اور نچلے خاندانوں کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کیا۔ سماجی میل جول کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی اس عقیدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی یا اس سے انکار کو کہ سارے مسلمان برابر ہیں۔ مذہب اس کی مذمت کرتا ہے اور خاص خاص موقعوں پر رائے عامہ اسے سخت ناپسند کرتی ہے۔ یہ بات اتنی واضح ہے اور اسے اتنی قبولیت کا درجہ حاصل ہے کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی کی مہمان نوازی حاصل کرنے کا حق ہے کہ اسے ہندستانی مسلم معاشرے کا بنیادی کردار کہا جاسکتا ہے۔

ہندوؤں کی طرح بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کسی بھی ملک کے لوگوں کی طرح ہندستان میں مسلمانوں کی موجودگی کے تین سرچشمے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ فتوحات، نقل مکانی اور تبدیلیٔ مذہب، مختلف نسلوں کے لوگ ایک دوسرے میں اس طرح مل گئے جس پر کسی قسم کا سماجی یا سیاسی کنٹرول ممکن نہ تھا۔

پہلے فتوحات کو لیں۔ وادیٔ سندھ پر محمد بن قاسم کا قبضہ، محمود غزنوی کے لوٹ مار کے حملے اور راوی تک کے علاقے پر اس کا قبضہ اور شہاب الدین غوری کے حملے جس کے نتیجے میں دہلی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ یہ سب سیاسی تاریخ کے واقعات ہیں۔ سلطنت تجارتی راستوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے پھیلی اور مدورا کی سلطنت کے قیام کے ساتھ جس کی زندگی مختصر تھی۔ جنوب میں اس کی انتہائی حد قائم ہوگئی لیکن فتوحات کا مطلب تھا مقابل فوجوں پر مسلم فتح۔ اگر کسی علاقے کے حکمراں نے اطاعت قبول کرلی تو تبدیلی بہت کم واقع ہوتی تھی۔ اگر اس نے اطاعت قبول نہیں کی تو اس کی اور حکمراں طبقے کی جگہ مسلمان یا اس علاقے کے مسلم نواز مقامی لوگوں کو بٹھا دیا جاتا تھا۔ عربوں اور ترکوں کی فوجوں سے ہم ہندستان میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کی کھوج لگاتے ہیں لیکن یہ فوجیں تعداد میں بہت کم تھیں اور دہلی سلطنت کی توسیع کا مطلب ان علاقوں میں جہاں اس کی فوجیں فتح حاصل کرلیتی تھیں۔ صرف حکومت میں تبدیلی تھی۔ بلکہ اکثر یہ بھی نہیں۔ آبادی میں مسلم عنصر کے اضافے کے اسباب دوسرے تھے۔ فتوحات نے صرف وہ موقعے فراہم کیے۔

جنوبی ہندستان کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر اولین عرب آبادیوں کی وجہ تجارت تھی اور تاجروں کو اپنے ملک کی حکومت کی تائید حاصل نہیں تھی جسے تجارتی گروانی بڑھانے میں دل چسپی ہوتی جیسی کہ موجودہ عہد کے اولین یورپی قسمت آزماؤں کو حاصل تھی۔ لیکن سندھ اور شمالی ہندستان میں قبضے کے بعد ہی مسلمانوں کی نقل مکانی اور آبادیاں شروع ہوئیں۔ یہ تارکین وطن وسطی ایشیا، افغانستان، ایران، مغربی ایشیا اور افریقہ کے مشرقی ساحل سے آئے۔ یہ اس لیے آئے کہ ان کے ملکوں میں حالات غیر یقینی تھے یا کچھ حاصل کر بیٹھنے کے لیے مہم بازی اور موقع کی تلاش میں آئے۔ لیکن یہ انتقال مکانی بہت بڑے پیمانے پر نہیں تھا بلکہ خاندان اور افراد کی آمد تھی جو بہت سست رفتار بھی تھی اور وقفے وقفے سے بھی تھی۔ ہاں شمال مغربی سرحد کے قبائلی علاقے سے پورے پورے قبیلے اور قبائلی گروہ آئے اور یہی وجہ ہے کہ سارے ملک میں جہاں بھی مسلمان خاصی تعداد میں ہیں وہاں اوپری طبقے کے ہندوستانی مسلم معاشرے میں پٹھانوں کی تعداد خاصی ہے۔ پھر ملک کے اندر ایک کونے سے دوسرے کونے تک نقل مکان ہوتی رہی۔ گزیٹیر کے مطابق ضلع منٹگمری کے ارائنوں کا دعویٰ تھا کہ وہ سورج بنسی راجپوت ہیں جو پہلے دہلی کے اطراف بسے ہوئے تھے۔ اترپردیش میں رامپور کے ترکیہ بنجارے کہتے تھے کہ ہم ملتان سے آئے ہیں اور رامپور اسٹیٹ گزیٹیر[27] کچھ خاندان شیوخ کا ذکر کرتا ہے جو پہلے جالندھر میں بسے ہوئے تھے اور بعد میں یہ لوگ جنوب مشرق کی طرف چل پڑے اور سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، بجنور، مراد آباد اور بدایوں میں بس گئے۔ ان باتوں کو ایک معمول سمجھنا چاہیے۔ دکن میں مسلم راج قائم ہونے

کے بعد تارکین وطن باہر سے بھی آئے اور ملک کے اندر شمال سے بھی کیرلا کی مسلم آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ دکن کے تارکین وطن پر مشتمل ہے۔

کبھی کبھی ترک وطن اور آبادیاں سیاسی دباؤ کا نتیجہ بھی ہوتی تھیں۔ مثلاً جب محمد بن تغلق نے امرا اور علما کے خاندانوں کو دولت آباد بھیجنے کی کوشش کی۔ مگر اصل وجہ روزگار اور مواقع کی تلاش تھی لیکن تہذیبی اور معاشی اعتبار سے یہ نقل مکانی چاہے جتنی اہم رہی ہو تعداد کے لحاظ سے یہ کم ہی رہی ہے۔

ہندستانی مسلمانوں کی غالب اکثریت ان پر مشتمل ہے جنھوں نے مذہب تبدیل کیا۔ تبدیلی مذہب کے وجوہ میں کوئی ایک یا کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ان سے ہم یہ اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں کہ یہ تبدیلی مذہب کس پیمانے پر ہوئی اور اس کا اثر کتنا ہوا۔ اس کے علاوہ ان خطرات کی اہمیت کو بھی کم نہ سمجھنا چاہیے جو زبردستی تبدیلی مذہب کی پالیسی سے پیدا ہو سکتے تھے۔ اسلام ان خاندانوں نے یا خاندانوں کے گروہوں نے قبول کیا جو اپنے پیشے کی وجہ سے ہندو سماج میں اچھوت سمجھے جاتے تھے یا حکومت کے تحت کوئی ملازمت اختیار کر کے مسلمانوں کے ساتھ ربط ضبط کی وجہ سے جات باہر کر دیے گئے تھے۔ فوج میں ملازمت کی بھی ایک کشش تھی۔ خاص طور پر جنگجو روایات کے حامل قبائلی گروہوں کے لیے اور اس قسم کی ملازمت کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ جات باہر کر دیے جاتے تھے۔ تبلیغ نے بھی اپنا پارٹ ادا کیا۔ خوجے، بوہرے اور میمن اس کی مثال ہیں کہ تبلیغ کے ذریعے کس طرح پوری پوری برادریوں نے مذہب تبدیل کیا۔ ان مسلمان برادریوں میں جنھوں نے بظاہر جزوی طور پر مذہب تبدیل کیا۔ بہت سی ایسی تھیں جن کی تبدیلی مذہب کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ کسی خاص پیر کی کرامات میں یقین رکھتی تھیں پیشوں کی وجہ سے جو برادریاں ہندو سماجی نظام میں جات باہر سمجھی جاتی تھیں انھوں نے اسلام، ظاہر ہے اپنے فائدے کے لیے قبول کیا ہوگا اور چونکہ یہ شہری برادریاں تھیں یا اپنی گزراوقات کے لیے شہروں پر انحصار کرتی تھیں اس لیے ان میں تبدیلی مذہب بھی زیادہ دوررس تھی۔

مذہب کی تبدیلی کے اصل لوگ صوفی تھے اور بڑے پیمانے پر جو تبدیلی مذہب ہوئی اس میں زیادہ تر غالباً پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ہوئی۔[28] لیکن حکایتیں اور حقیقتیں ایک دوسرے میں ایسی الجھ گئی ہیں کہ ان میں سے کسی واقعے کی صحت کے ساتھ تاریخ مقرر کرنا ممکن نہیں۔

جس طرح ہندستانی مسلم معاشرے کی بتدریج تشکیل ہو رہی تھی اس کے لیے ان قوتوں کا تعین ضروری ہے جنھوں نے اس کے مختلف النوع عناصر کو جوڑ کر رکھا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے سیاسی مفاد مجموعی حیثیت سے پوری برادری کا مفاد نہیں بلکہ حکمراں طبقوں اور گروہوں کا مفاد تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے روزگار کے مواقع بہم پہنچا کر، دولت حاصل کرنے اور اثر حاصل کرنے کے موقعے فراہم کر کے اور ادب، فن اور کلچر کی سرگرمیوں کو فروغ دے کر ایک قسم کی یگانگت پیدا کی۔ لیکن دہلی سلطنت اور مغلیہ سلطنت جیسی طاقتور ریاستوں کی تشکیل کے باوجود عام رجحان ہندستانی مسلمانوں کو ایسی سیاسی اکائیوں میں تقسیم کرنے کا تھا جو ایک دوسرے کی دشمن ہونے کی صلاحیت رکھتی تھیں بلکہ دشمن تھیں ہمیں کوئی مشترکہ معاشی مفاد بھی نظر نہیں آتا۔ جو لوگ پیشوں میں لگے ہوئے تھے اور تجارت میں مصروف تھے وہ حکمراں طبقوں کی سرپرستی کے محتاج تھے۔ لیکن حکمرانوں کی تبدیلی کی وجہ سے معاشی نظام پر کوئی اثر نادر وشاذ ہی پڑتا ہو۔[29] پیشہ ورانہ اور پیداواری طبقوں کے اندر روایت اور ریت رواج، پیشہ ورانہ اخلاقیات اور ''برادری'' کا نظام ایک جوڑنے والی قوت تھی۔ عام طور پر ان طبقوں اور برادریوں میں جو علاحدگی پسندی اور خود پسندی ہوتی ہے وہ سماجی یگانگت کے خلاف جاتی ہے۔ ہندستانی مسلمانوں کے اندر واحد اتحادی عنصر اسلام سے وابستگی تھی۔

اس وابستگی نے یہ جذبہ پیدا کیا کہ ہم ایک ملت سے متعلق ہیں اور یہی وہ جذبہ ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس نقطے پر مذہب، حفاظت ذات کی جبلت، سیاسی مفاد اور معاشرتی روایات مل جاتے ہیں۔ یہ جذبہ کئی پیڑھیوں تک خوابیدہ اور مخفی رہ سکتا ہے لیکن بہت ہی مختصر مدت کے اندر اسے بھڑکا کر آگ بنایا جا سکتا ہے۔ عام طور پر جو سماجی تحدید اور روک لگی رہتی ہے اس سے یہ نجات پانے کی مسرت لائی ہے اس نے اصلاح کے لیے تحریکوں کی تائید کی ہے۔ معمولی حالات میں اس کا سب سے نمایاں اظہار وہ جذباتی ردِعمل ہے جو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ایک اجنبی اپنا تعارف کراتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور اس کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے مسلمان ایک بہت بڑی ملت ہیں۔ یہ جذبہ عام طور پر گروہی تعصبات یا مادی مفادات پر حاوی نہیں ہو سکا۔ عام طور پر یہ عمل سیاسی قوت بھی نہیں بنا۔ لیکن اگر ہمیں ہندستانی مسلمانوں کی تعریف مقرر کرنی پڑے تو ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ ہندوستانی ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، جو ایک مذہبی اور سماجی برادری کی حیثیت سے مسلمانوں کے اتحاد اور یگانگت پر یقین رکھتے ہیں اور جو عمل کے ذریعے دکھانے کے اہل ہیں وہ اس عقیدے کے مطابق ہی کام کرتے ہیں خواہ آپس میں مذہبی عقائد اور اظہار عقائد میں فرق کتنا ہی کیوں نہ ہو۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک ملت کی حیثیت سے ہندستانی مسلمان بے چہرہ ہے اس کے برعکس برادری کے اندر جو تنوع ہے جو ساری دنیا میں اسلامی طرز زندگی میں وسیع تنوع کی عکاسی کرتا ہے اس نے اس اتحاد کے

تصور کو اور بلند کردیا ہے۔ قوم پرستی کی موجودہ تعریفیں، خاص طور پر ان سیاسی اکائیوں میں جو غیر متجانس عناصر پر مشتمل ہیں۔ سیاسی اتفاق و اتحاد کے لیے قوت ارادی کو فیصلہ کن عناصر مانتی ہیں۔ اتحاد کی خواہش کا یہی وہ خوابیدہ جذبہ تھا جس کو بہت ہی آسانی سے استعمال کرکے ہندستانی مسلمانوں کی شخصیت کے سوال کو الجھا دیا گیا جو اسلام میں یقین رکھنے والی شخصیت تھی اور انھیں ایک الگ سیاسی اکائی کی شخصیت، ایک قوم کی شخصیت کہا گیا جو کہ وہ کبھی نہیں تھے اور نہ کبھی ہونا چاہتے تھے۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ہندستانی مسلمانوں کے مختلف عناصر میں ان کے مبدا، سماجی ڈھانچے، عقائد اور رسوم میں جو اختلافات نظر آتے ہیں ان کے متعلق ہم یہ فرض کرسکتے ہیں کہ کمی یا بیشی کے ساتھ یہ ابتدا ہی سے تھے۔ ان کا آدرش تھا کہ وہ ایک گتھی ہوئی، مساوات پر عامل ملت ہوں جو اسلام پر یقین رکھتی ہو اور اس کا اظہار روزانہ کی زندگی میں نظر آئے۔ یہ صرف ایک آدرش تھا کہ چونکہ مسلمان ہیں اس لیے خود بخود ایک سیاسی فرقہ بھی ہیں۔ سیاسی اقتدار ان کی اجتماعی زندگی کی نامیاتی تکمیل نہیں تھی بلکہ ایک خارجی، بے تعلق عنصر تھا۔ ایک واضح اور مشترکہ مذہبی کردار حاصل کرنے کی کوششوں کی وجہ سے مختلف قسم کے ردعمل پیدا ہوئے۔ کچھ نے ہندستانی مسلم فرقے کے کچھ عناصر میں عقیدے اور عمل کی طرف زیادہ کٹر پن پیدا کیا، کچھ دوسرے ردعمل تھے جنھیں ہم حصول خودی میں مہم بازی ہی کا نام دے سکتے ہیں انھوں نے افہام وتفہیم کا وہ راستہ کھولا جس کی وجہ سے اسلامی دائرے میں وہ لوگ بھی شامل کرلیے گئے جن کے درمیان اسلام پوری طرح پیر جما بھی نہیں سکا تھا۔ ہندستانی مسلمانوں نے اپنے آپ کو اور دوسروں نے ہندستانی مسلمانوں کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں الگ الگ ہی دیکھا ہے۔ مجموعی حیثیت سے ان کی برادری کو دیکھنے کے لیے ہمیں ہندستانی مسلمانوں کی پوری تاریخ میں ان کے تمام پہلوؤں کو دیکھنا ہوگا۔ اس کی بدولت ہم ان مختلف قوتوں کو سمجھ سکیں گے جو ہندستانی مسلمانوں میں کارفرما تھیں۔ ان کی کمزوری اور قوت کے عناصر کو الگ الگ کرکے دیکھ سکیں گے۔ ان کے ماضی کو سمجھ سکیں گے اور ان کے مستقبل پر روشنی ڈال سکیں گے۔ ایک معروضی رویہ اختیار کرنے کی خواہش کہیں بھی عام نہیں ہوتی اور ہندستانی مسلمانوں نے خود اپنے متعلق جو حکم لگائے ہیں ان کی پشت پر یا تو خود اپنی تعریف کا یا خود رحمی کا جذبہ رہا ہے وہ یا تو اپنا ایک مثالی نقشہ پیش کرتے ہیں کہ بس وہی مذہبی صداقت اور سیاسی فہم کا مجسم نمونہ ہیں یا پھر بالکل اسی طرح غیر متوازن ہوکر اپنی مذمت کرتے ہیں کہ ہم ایک ملت کی حیثیت سے ان بزرگوں کے نام پر بٹہ ہیں جنھوں نے ساری دنیا میں خدا کا پیغام پہنچایا اور سماجی اور سیاسی عدل کی اعلیٰ ترین مثالیں پیش کیں۔ یہ دونوں انتہا پسند نقطۂ نظر گمراہ کن ہیں۔ ان میں آسان طلبی بھی ہے جو تاریخ اور عصری زندگی کی اس سمجھ بوجھ کو اثر طور پر روکتی ہے جو صحت مند ارتقا کے لیے ضروری ہے۔ ایک تیسرے قسم کا حکم جو گزشتہ سو برس کی اعتذار پسندی کا ایک پہلو ہے۔ موازنے اور مقابلے کا ہے۔ مغربی طرز زندگی کے نقائص اور ہندوؤں کے طور طریقوں اور رسموں کو یہ دکھانے کے لیے لیا جاتا ہے کہ مسلمان لاکھ برے سہی لیکن کچھ لوگ ان سے بھی برے ہیں۔ جواز ڈھونڈھنے کا یہ طریقہ صرف مسلمانوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے اور حقیقت کی کھوج میں یہ کبھی کبھی ضروری بھی ہوجاتا ہے کہ اداروں، رویوں اور عمل کا موازنہ کیا جائے تاکہ جن کا مطالعہ کیا جارہا ہے انھیں صحیح پس منظر میں پیش کیا جاسکے۔ اس کتاب میں جذباتی اور نتیجے پر پہنچنے سے پہلے فیصلہ کرنے سے احتراز کیا گیا ہے اور ایسے موازنوں اور مقابلوں کو جو کسی تنقید میں تبدیلی پیدا کریں قارئین کی انصاف پسندی پر چھوڑا گیا ہے۔ مصنف کا یہ راسخ عقیدہ ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے پاس ان کے مذہب اسلام میں اور اسلام کی اخلاقی اور روحانی قدروں کے سچے نمائندوں میں فیصلہ کرنے کے انتہائی قابل اعتماد معیار موجود ہیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ کتنی بلندی پر یا کتنی پستی میں ہیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حواشی:

1. گوتر خاندانوں کے ایک گروہ کو کہتے ہیں جس کا خاندانی نام ایک ہوتا ہے۔
2. Gazetteer of Alwar, trubner and Co, London, 1878, P 37 ff and P 70
3. ایک رسم جس میں بیوہ کی شادی نچلی ذات کے مرد سے کی جاتی ہے۔
4. ایک بھاری چوڑا مڑا ہوا کھرا۔
5. Bundi State Gazetteer P 223
6. سید محمد جونپوری۔ ان کی حیات اور کارناموں پر آگے بحث کی جائے گی۔
7. E.L. Carter, in the Indian Antiquarty, Vol. XLVI (1917), PP 205 ff.
8. Sindh Gazetteer, Vol. A (1907) Mercantile Steam Press Karachi, PP 160 ff.
9. Imperial Gazetteer of India, Provincial Series Baluchistan, P 30.
10. Patna District Gazetteer, P 69.
11. Purnea District Gazetteer, Vol. XXV, Bengal District Gazetteer, Calcutta, 1911, PP 58 ff.

12. Bengal District Gazetteer, Vol. XXXI, 24 Parganas, Calcutta, 1914. PP 74-76.
13. Ibid, Vol. I, Chittagong, Calcuta, 1908, PP 56 ff.
14. ابتداء وہ خفیہ پولیس افسر جو گاؤں میں متعین کیے جاتے تھے۔
15. Indore State Gazetteer, Calcutta, 1908 P 59.
16. Gazetteer of the Bombay Presidency, Vol. IX, Part III, Bombay 1690, P 12 n.
17. Ibid, Vol. VII, Baroda, P 72.
18. Ibid, Vol. IX, Part II, PP 69 and 64.
19. Ibid, Vol. III, P 226.
20. Ibid, Vol. IX, Part II, PP 19-24 and 58-85.
21. Ibid, Vol. V, Cutch, Palanpur and Mahikantha, P 91.
22. Ibid, P 99
23. Central Provinces Gazetteer, Vol. XIV, Nimar, Allahabad, 1908, P 63.
24. Central Provinces District Gazetteer, Vol. XVII, Seoni Distt. Allahabad 1907. P 221.
25. Ibid, Vol. XXIII, P 282.
26. Ibid, Vol. XXIII, P 296.
27. Rampur State Gazetteer, Allahabad, 1911, P 49.
28. عبدالقادر بدایونی نے ایک واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے جیسے تبدیلی مذہب خاصے بڑے پیمانے پر ہوئی:۔ منتخب التواریخ۔ ببلیو تھیکا انڈیکا جلد III ص 22
29. ظاہر ہے اس کا اطلاق سامراج اور صنعتی انقلاب کے عہد پر نہیں ہوتا۔

□□□

تحریکِ خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندستان میں چلائی جانے والی تحریکِ خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریک خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 219 صفحات، قیمت 65.00 روپے

تالستائے

مصنف: ڈاکٹر محمد یٰسین

تالستائے کی تصانیف ہمیں خواب وخیال کی دنیا سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس کے یہاں حیات وکائنات کا عرفان بھی ہے اور عام انسانی جذبات واحساسات کی عکاسی بھی۔ اس کتاب میں تالستائے کے سوانحی گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے فنی کارناموں پر بھی۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 152 صفحات، قیمت 46.00 روپے

بابر نامہ

تلخیص کار اور مترجم: ڈاکٹر محمد قاسم صدیقی

"تزک بابری" کی تلخیص اور آسان اردو میں ترجمہ۔ یہ تلخیص ان حصوں پر مشتمل ہے جن میں بابر نے بہ طور خاص ہندستان کے رسم ورواج، یہاں کے موسموں، یہاں کی آب وہوا یہاں کے پھلوں اور پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے خصوصی دلچسپی کی حامل ہے۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 101 صفحات، قیمت 15.00 روپے

برنارڈ شا

مصنف: عبدالمغنی

جارج برنارڈ شا ایک روشن خیال اور انسان دوست ادیب اور مفکر تھا جو نسل یا قومیت کی حد بندیوں سے نکل کر پورے عالم انسانیت کی بہتری کا خواہاں تھا۔ اس کتاب میں برنارڈ شا کے شخصی اور ادبی اوصاف تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن، ڈیمائی، 96 صفحات، قیمت 35.00 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

اظہر علی فاروقی

("اتر پردیش کے لوک گیت" سے اقتباس)

لوک گیت

کچھ عجیب اتفاق ہے کہ بعض چیزیں جن سے ہم بخوبی مانوس ہوتے ہیں اور ان کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں، اگر ان کے بارے میں کوئی پوچھ بیٹھے کہ فلاں چیز کی تعریف کیجیے تو ہمیں نہ صرف سوچنا پڑتا ہے، بلکہ اس کی کوئی جامع مانع تعریف کرنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ لوک گیت بھی اسی قسم کی چیز ہیں، جن سے ہم اور آپ بخوبی واقف ہیں۔ پھر بھی اس سوال کا جواب دینا کہ لوک گیت کیا ہیں؟ ذرا دشوار سا بن جاتا ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب لوک گیتوں پر کام کرنے والوں اور ان کو پرکھنے والوں میں خود بھی اختلاف رائے ہو۔

ہنسنا، رونا اور گانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے، انسان خواہ شہری ہو یا دیہاتی، مہذب ہو یا نامہذب، خواندہ ہو یا ناخواندہ، کم سواد ہو یا ان پڑھ، مرد ہو یا عورت بوڑھا ہو یا جوان بچہ ہو یا مراہق یا کشور جب اُسے کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو رو پڑتا ہے اور جب مسرّت ہوتی ہے تو مُسکراتا ہے، ہنستا ہے اور کبھی کبھی گانے لگتا ہے۔ دیہاتی بھی انسان ہیں وہ اپنے سینوں میں حسّاس دل رکھتے ہیں۔ ممکن ہے حسّاس ہونے میں پڑھے لکھے لوگوں کا مقابلہ نہ کرسکیں پھر بھی جذبات اور احساسات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ جذبات اور احساسات شاعر شاعری میں اور ان پڑھ دیہاتی گیتوں کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔

ایک گڈری جنگل میں بھینسیں چرا رہا ہے، موسمی خوشگوار فضا اس کے جذبات میں ایک نئی جان پیدا کردیتی ہے اور وہ چہکنے لگتا ہے۔

باگھ کی نائیں چھکوں چھکرا دل بادل گہرائے
ہمرے سُبدسُن کے گوری دوری دوری آئے

(شیر کے مثل چھکرا گاؤں کہ زمین آسمان ہل جائے اور ہمارے بول سُن کر ہماری محبوبہ دوڑی دوڑی چلی آتی ہے......)

اسی جذبے کی ترجمانی ایک شاعر اس طرح کرتا ہے۔

کشش عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ
کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے

شعر کے الفاظ کی شگفتگی، چکاچوندھ ضرور پیدا کردیتی ہے اس لیے کہ ان میں شہریت ہے اور چھکرے کے الفاظ میں وہ شگفتگی نہیں اور الفاظ دیہاتی ہیں جو شہری خواندہ لوگوں کے لیے نامانوس اور ثقیل ہیں مگر ان میں ایک قسم کا لوچ اور سریلا پن ضرور ہے، شعر میں ترنم ہے اور چھکرے کے بول میں لحن۔

یہی وجہ ہے کہ لوک گیت کہنے پر عام طور سے وہ گیت سمجھے جاتے ہیں جو دیہات اور دیہاتیوں کی زندگی کے ترجمان ہوں۔ دیہاتی سماج کی نمائندگی کریں اور جن پر شہری تمدّن اور سماج کی چھاپ نہ ہو اور شاید اسی لیے لوک گیت کی اصطلاح سے پہلے ان کے لیے گرام گیت کا لفظ مستعمل رہا ہے۔

عہد عتیق میں کسی باعظمت راجا کی کارگزاریوں اور اس کی شان وشوکت جاہ وجلال کی ستائش میں جو اشعار شاعر بناتے اور پڑھ پڑھ کر سناتے تھے ان کو گاتھیہ (गाथक) اور گانے والے کو گتھت (गथित) کہا جاتا تھا۔ ان میں سے جو اشعار لوک جن میں مقبول ہوکر ازبر ہو جاتے انھیں لوک گاتھیہ یا لوک گاتھا کا نام دیا جاتا تھا اور اسی سے لوک گیت بن گیا۔

یہی حال ان ستائشی یکیہ گاتھاؤں کا سمجھیے جو اشومیگھ یکیہ کی تقریبوں پر گائے جاتے تھے، ان میں سے کچھ عوام کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہوں گے اور وہ انھیں اپنا لیتے ہوں گے۔ انھی گاتھاؤں نے بعد میں وہ صورت اختیار کرلی جن کو ہم آج لوک گیت کہتے ہیں۔

ان باتوں سے یہ تو ظاہر ہے کہ لوک گیت دیہاتیوں اور دیہی سماج سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔

پنڈت رام نریش ترپاٹھی نے کوِتا کومیڈی — گرام گیت اور گجراتی زبان کے لوک گیتوں کے مجموعے رڑھیالی رات (اندھیری رات) میں صفحہ 6 پر اور جھیر چند میگھانی گجراتی لوک گیتوں کے مُفسّر نے ان کا تعارف بہت کچھ اس طرح کرایا ہے۔

ان پڑھ دیہاتیوں کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ جذباتی بول جو شعری اور لسانی پابندیوں سے آزاد ہوں پھر بھی ان میں لحن اور ایک قسم کا میٹھا سُر ہو...... اڑیسہ کے لوک گیتوں پر کام کرنے والے کے.بی.داس اڑیا لوک

● لوک گیت ہمارا قیمتی ورثہ ہیں۔ ہمارے لوک گیتوں میں ہندستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اظہر علی فاروقی نے اترپردیش کے وہ تمام گیت یکجا کردیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے سکھ دکھ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 652 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف -/120 روپے ہے۔

گیتوں کے مجموعے میں ان کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

''عوام کے دلوں سے نکلے ہوئے وہ بول جو غیر اختیاری طور پر اضطراری حالت میں کسی المناک یا طربناک جذبے سے تاثر کے بعد نکل جاتے ہیں۔......''

سچ پوچھیے تو لوک گیتوں کی طرف ہماری توجہ منعطف کرنے والے وہ مستشرق ادیب ہیں جنھوں نے بے لیڈ (Balade) اور فوک سانگ (Folk-Songs) پر بڑی کاوش اور خلوص سے کام کیا ہے۔ چنانچہ ہم آپ کے سامنے ایک محقق موسیو ان پیر کی وہ رائے پیش کرتے ہیں جو انھوں نے 1853 میں ایک لوک گیت سار وہ مشن کے حاضرین کے سامنے پیش کی تھی۔

''بے لیڈ کا مادّہ دراصل لاطینی لفظ ''بے لارے'' ہے جس کا مطلب ہے کہ کسی لوک منڈلی نے لوگوں کے لیے جو گیت تیار کیے ہوں اور جو سینہ بہ سینہ پیڑھی در پیڑھی ساری یورپی قوموں میں یکساں واقعات اور طرز لیے ہوئے پائے جاتے ہوں۔''

موصوف نے ان کے کچھ امتیازی اوصاف اس طرح بتائے ہیں:

قافیہ اور ردیف کی جگہ محض لحن میں یکسانیت اور شعری پابندیوں سے بالکل آزاد روزمرہ مستعمل عام چیزوں کو سونے اور چاندی کا بنا ہوا بتانا۔ ہمارے لوک گیتوں میں سونے کا گڑوا ہے، جس میں گنگا جل بھرا ہوا ہے۔ سونے کے تھال میں بھوجن پروسا جا رہا ہے۔ سونے کا محل ہے چاندی کے کیواڑ ہیں۔

تین، پانچ اور سات جیسے طاق اعداد کا استعمال۔ پنچ محلا ہے، پنچ ہیں۔ سات بھائیوں کی چہیتی ایک بہن ہے۔ دو تلا بنگلا کوٹھا ہے۔

اس معنی میں ہمارے لوک گیت موسیو آن پیر کی رائے سے بہت کچھ مطابقت رکھتے ہیں۔

لوک گیتوں کا وجود اور قدامت

ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ رونا اور گانا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسان تو انسان فطرت کی کوئی چیز اس سے خالی نہیں نظر آتی۔ پانی کے جھرنے جھر جھر کرکے گاتے ہیں۔ پتے کھڑکھڑا کھڑکھڑا کر ناچتے ہیں۔ سمندر کی لہریں اُٹھ اُٹھ کر جوش میں آکر بھنور کے گھنگرو پہن کر رقص کرتی ہیں۔

فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ گیت انسان کے وجود کے ساتھ جنمے ہوں گے۔ کب اور کس طرح؟ اس کا صحیح صحیح وقت بتانا، ظلمات کو تلاش کرنے سے کم دشوار نہیں ہے۔ ویسے اتنا پتہ تو لگ ہی جاتا ہے کہ رگ وید کے بہتیرے منتروں (99/9/48/32/1) وغیرہ میں گاتھیہ اور گاتھست کے لفظ آئے ہیں جن کا مطلب گیت اور گویا ہے۔ اس طرح عہد عتیق کی نگارشات جن میں گاتھاؤں کا بیان ملتا ہے۔ وہی لوک گیتوں کی قدیم نمائندگی کرتی ہیں۔

حضرت داؤد کی زبور اور ان کا خوش آہنگ لحن اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ گیت اور موسیقی دونوں اس وقت موجود تھے۔

عہد قدیم میں کسی مخصوص فرماں روا کی کارگزاریاں، اس کے فلاح و بہبود کے کارناموں کے ستائشی گاتھا۔ بہت کچھ تبدیل ہوکر عوام کے زبان زد ہوجاتے تھے اور پیڑھی در پیڑھی سینہ بہ سینہ چلتے رہے تھے جو بعد میں جن گاتھا یا لوک گیت کے نام سے مشہور ہوگئے۔

اشومیدھ یگیہ کی تقریبوں پر جو ستائشی گیت گائے جاتے تھے جو یگیہ گاتھا کہلاتے تھے۔ بہت کچھ تغیر کے ساتھ لوک جنوں تک پہنچے۔ جو لوک گیتوں کی نمائندگی کرسکتے ہیں۔

بکرمی سمبت کی تیسری صدی میں راجا وشال واہن کی تالیف کردہ ''سپت شتی گاتھا'' سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت لوک گیت بنانے اور گانے کا چرچا تھا اور بڑا زور تھا۔

بارھویں صدی عیسوی کی مشہور شاعرہ وجکانے دھان کوٹنے اور کھانا پکاتے وقت لکڑیاں جلانے، دھواں اٹھنے اور پھونکتے وقت آنسو نکل آنے وغیرہ کا بیان جس انداز میں کسا ہے وہ بہت کچھ لوک گیتوں کے پیرایہ بیان سے ملتا جلتا ہے۔

(2)

مسلمان یوں تو دکن کے ساحلوں پر بسلسلۂ تجارت بہت پہلے سے آتے جاتے رہے، یہاں کالونیاں بھی بنائیں۔ شادیاں کیں جس سے عرب ہندی مخلوط ایک فرقہ موپلا (ماؤپلا۔ پروردۂ مادر) بھی پیدا ہوگیا۔ محمد بن قاسم نے آٹھویں صدی عیسوی میں دابیل (کراچی) سے بھٹنڈہ اور ملتان تک ایک طرف اور گوالیار تک دوسری طرف فتح کرکے ایک سلطنت قائم کی۔ عراقی عربوں نے اپنی معاشرت کا سندھیوں پر گہرا اثر ڈالا۔ بصل (پیاز) تھوم (ثوم۔لہسن) موَیا (ماہ پانی) کھلج (ثلج، برف) وغیرہ جیسے سیکڑوں عربی الفاظ سندھی زبان میں داخل ہوگئے۔ محمود غزنوی اور محمد غوری نے متعدد حملے کیے، صوفیائے کرام اور درویشوں کی آمد و رفت بھی برقرار رہی۔ اسی حالت میں نہ صرف معاشرت اور زبان کے صدہا الفاظ کا لین دین ہوتا رہا ہوگا بلکہ مذہبی جذبات پر بھی اثر ہوتا رہا ہوگا اور اس طرح اس اختلاط اور ارتباط سے ایک ایسی بولی پیدا ہوگی جو لوک گیتوں میں رائج ہوگی۔

اوائل تیرھویں صدی میں 1206 سے دلی سلطنت کی بنیاد پڑی اور ہزارہا مسلمان ہندستان میں رہ بس گئے۔ پھر سلطنت مغلیہ کی بنیاد 1526

میں پڑ جانے کے بعد اکبری دور تک اس تین ساڑھے تین سو سال کے وقفے میں زبان اور بول چال کے لب و لہجے میں بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ ترکی اور فارسی زبانوں پر برج بولی مسلط ہونے لگی اور برج بولی ترکی اور فارسی الفاظ اپنانے لگی۔ اس طرح ایک ایسی بولی کی زمین ہموار ہونے لگی جو لوک گیتوں میں کام آئی۔ پھر بھی اندازہ ایسا ہوتا ہے کہ سلاطین اور امرا کے خاندانوں میں ترکی اور فارسی گیتوں کا ہی رواج رہا اور ان کی دیکھا دیکھی لوک جن بھی انھی سے کام چلاتے رہے۔

حضرت امیر خسروؒ کی ایک بوقلموں مقدس شخصیت کا سراغ ضرور ملتا ہے۔ جنھوں نے اس نوزائیدہ بولی اور ہندستانی لب و لہجے میں کچھ ایسے گیت لکھے جنھیں ہم لوک گیتوں کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں۔ قال، رنگ شریف، قوالی، خیال جیسے راگ اختراع کیے جو بعد میں چل کر عوام کے ہاتھوں لگے۔

دھیرے بھوند یا مورے پیا ہیں اترت پار
سکھی کے دیاناباروشند یا ہمرے گھر آئے محمد بانرا
جو میں جن تیوں بچھرت ہیں سیاں
گھونگھا میں آگ لگائی دے تیوں
رکھ لیو ان بچرئین کی لاج مورے ساجنا

لیکن امتداد زمانہ اور ہماری بے توجہی اور بے اعتنائی کے باعث ایسے گیت مفقود ہو گئے، بدشواری ایک آدھ بول مل جاتے ہیں۔

دیسی بولیوں کے گیتوں کا رواج پہلے پہل شاہزادہ سلیم (شاہنشاہ جہانگیر) کی شادی کی تقریب سے بتایا جاتا ہے، جب رخصتی کے وقت راجپوتوں کی طرف سے اس قسم کا گیت گایا گیا:

تم شاہنشاہ ہم آپ کے داس
رہے کرم شاہ کا ٹوٹ نہ جائے آس

یہ سُن کر شہنشاہ اکبر نے جذباتی انداز میں ڈولے کو ہاتھ لگایا اور ان کی زبان سے نکلا:

ہم شاہنشاہ سہی پھر بھی آپ کے بھائی
اور راجکماری محل کی آبرو اور چوکھٹ کی لاج

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کے بعد لوگوں نے اس طرف توجہ کی اور امرا اور اعلا طبقے کے خاندانوں میں ترکی اور فارسی گیتوں کے بجائے شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں میں اور سنسکاروں پر دیسی بولیوں کے گیت گائے جانے لگے ہوں گے، اور اس طرح میراسنوں کلاونتیوں اور بھانڈنیوں وغیرہ کے گروہ بن گئے جو تقریبوں پر نہ صرف گیت گاتی ہوں گی۔ بلکہ بنا بھی لیتی ہوں گی۔ اس طرح مختلف تقریبوں کے لیے رنگارنگ گیت ڈھلنے لگے۔ بنری، بنرا بانی، بنا شادیانے رت جگا، خدائی رات، دھن چھوا، ونت رنگا، گھڑے بھرائی، جلوا، ٹونے، گالیاں یا سیٹھنیں وغیرہ قسم کے گیت وجود میں آنے لگے۔ موسمی گیت فطرت کی دین ہیں اور یہ نسبتاً بہت قدیم ہو سکتے ہیں۔

پس ماندہ اقوام کے گیتوں کے بارے میں وثوق یہ کہنا تو دشوار ہے کہ گذریوں اور مسلمان گھوسیوں کے چھکرے اہیروں کے برہوں کی نقل ہیں یا خود ان کی ذاتی اپج ہے۔ دفالیوں اور مجاوروں کے گیت سید سالار مسعود غازیؒ کی شہادت اور ان سے والہانہ عقیدت مندی کی دین نظر آتے ہیں۔

بہرکیف گیت کا وجود بالکل فطری نظر آتا ہے اور انسان ہیں یہ جذبہ بہت قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے۔ اگر بنی نوع انسان اور شاعری دونوں ہم عمر کہے جا سکتے ہیں تو لوک گیتوں اور بنی نوع انسان کی ہم عمری میں بھی کوئی شبہ پیدا نہ ہونا چاہیے۔

وقت کا تعین

کون سے لوک گیت کب بنے؟ اس کا تعین بڑا دشوار ہے پھر بھی ان میں مستعمل الفاظ اور کچھ واقعات اس طرف اشارہ ضرور کر دیتے ہیں:

عورتاں ٹھاڑیاں لٹ چھترائیاں کریں بیان
دُس موں نہارنہار ماریاں بکل کاریاں

دہے کا یہ بول بتاتا ہے کہ یہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب عورتاں ٹھوڑیاں وغیرہ قسم کی صرفی ترکیبیں مستعمل تھیں اور سترھویں صدی عیسوی یا کچھ بعد کا ہونا چاہیے۔

پاین سو ہے سکلاتی جوتا
موجے میں چھپی آئی رے
بنا مرا خوب بنا

اس بول کے دو لفظ سکلاتی اور موجے (موزے) بتاتے ہیں کہ یہ گیت اس وقت کی یادگار ہے جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر سکلات کپڑا خریدتے تھے اور موزہ صاف ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کی دین ہے۔

آگرہ ملتان صدقے
کابل اور قندھار صدقے

سارا ہندستان صدقے
لونڈی کا گھر بار صدقے

لوری کے یہ بول بتاتے ہیں کہ یہ لوری اسلامی عہد حکومت کی یادگار ہے جب کابل اور قندھار بھی ہندستان میں شامل تھا۔

لمبی لمبی دھوتی اور اودی اودی پگڑی
ڈھال تلوار کٹار چلی اور چھری
کاہے کو تم چھوڑ چلے ساجنا
دلّی کے بازار لٹے
جودھا کتنے مرے کٹے
جاٹ آئے اور چلے
مرہٹن لوٹا اور چلے گئے
میں دکھیاری آنسو بہاؤں
ساجن موئے سلطان صدقے

یہ گیت نما بول اس وقت کے معلوم ہوتے ہیں جب انیسویں صدی میں جاٹ اور مرہٹے دلّی پر لوٹ مار کے لیے چڑھ آتے تھے۔

بھوج پوری بولی کا یہ گیت پڑھیے جو 1857 کے ہنگامے کی یاد دلاتا ہے:

لکھ لکھ چِٹیا کے بھیجن کنور سنگھ
اے سُن اِمرسنگھ بھائے ہو ......
چمڑا کے ٹرٹا وادانت سے ہو کاٹے کہ
چھتری کے دھرم نسائے ہو......
بابو کنور سنگھ اور بھائے امر سنگھ
دو آد اپنے ہیں بھائے ہو......
بِتا کے کارن سے بابو کنور سنگھ
فرنگی سے ریڑھ بڑھائے ہو......
دانا پر سے جب کمپل ک ہو کپو
کوئل در میں رہے چھائے ہو......
لاکھ گولا تبو کے گنی ک موائی ہوں
چھوڑ بُڈھواک راج ہو......
روووت باڑے بابو کنور سنگھ
مکھوا پے دھرک رومال ہو ......
لیے لی لڑئیا ہم تو بڑھوا سے میں
اب کون ہوئی ہیں حوال ہو......

کنور سنگھ نے امر سنگھ کے پاس لکھ کر ایک خط بھیجا۔ اے بھائی سنو! چمڑے کے کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے سے چھتری دھرم چلا جائے گا۔ کنور سنگھ اور امر سنگھ دونوں بھائی ہیں، کسی بات کے سبب سے انگریزوں سے لڑائی ٹھان لی۔ دانا پور سے انگریزوں کا کیمپ اٹھا تو کوئل در میں ڈیرے خیمے پڑ گئے۔ انگریزوں کے کہا گن کر لاکھ گولے ماروں گا۔ ورنہ بڑھے کا راج چھوڑ دو۔ کنور سنگھ منہ پر رومال رکھ کر رو رہے ہیں کہ افسوس بڑھاپے میں لڑائی مول لے لی۔ آگے نہ جانے کیا حال ہوگا؟

سندھی گیتوں میں بعض بعض گیت اس عہد کی یاد دلاتے ہیں، جب محمد بن قاسم نے وہاں حکومت قائم کر رکھی تھی اور عربوں کا تسلط تھا۔ نہ جانے کس طرح اور کس حال میں ایک سندھی لڑکی گرفتار ہو کر آئی، وہ اجنبی عربوں میں گھبرا رہی ہے اور اپنے ماحول میں، اپنے [illegible] کے لیے بے چین ہے۔ اس کے جذبات کی ترجمانی کسی لوک گیت کار نے اس طرح کی ہے کہ وہ حضرت عمرؓ کے انصاف کی دہائی دیتی ہے، اگرچہ وہ باحیات نہیں تھے اور طنزیہ دھمکی بھی دیتی ہے:

میں آپ کے دیے ہوئے ریشمی کپڑے کیا کروں
میں تو جس دن سے یہاں آئی ہوں اپنے کھیت یاد آتے ہیں
رہ رہ کر پیرو کے پھل توڑنے کو دل چاہتا ہے
میں نہ ریشمی کپڑے پہنوں گی اور نہ بچھونے پر لیٹوں گی
مجھے تو موٹے جھوٹے کپڑے کی انگیا چاہیے
اے عمرؓ! اگر آپ انصاف کر کے مجھے میرے گھر پہنچا دیں گے
تو یقین کیجیے میں اپنی سہیلیوں سے آپ کے انصاف کے گیت گاؤں گی
ورنہ بدنام کردوں گی

مختصر یہ کہ لوک گیتوں کے وقت کا تعین الفاظ اور واقعات کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے، وہ بھی محض دور اور وقفے کا۔

□□□

سلمان عابد

کیریئر گائیڈنس

انگریزی اور غیر ملکی زبانوں میں کیریئر

کاروبار حیات کے بیشتر شعبے ایسے ہیں جہاں زبان سے واقفیت، زبان کا علم اور زبان کی مہارت کسی بھی فرد کی زندگی اور اس کا کیریئر بناتی ہے۔ ہر فرد کو اپنی مادری زبان پر قدرت تو حاصل ہوتی ہی ہے ساتھ ہی ساتھ علاقائی زبان سے واقفیت بھی بھر پور ہوتی ہے جس سے بڑی حد تک کام چل جاتا ہے۔ مگر ہر محاذ پر اور ہر شعبۂ حیات میں کامیابی کا پرچم اسی صورت میں لہرایا جاسکتا ہے جب انگریزی زبان سے واقفیت اور اس میں مہارت حاصل ہوجائے۔ اس کے علاوہ اگر دیگر غیر ملکی زبانوں سے بھی واقفیت ہو تو یہ کسی بھی طالب علم کے کیریئر کے لیے سونے پر سہاگہ کا کام کرے گی۔

زندگی کے سیکڑوں شعبے ایسے ہیں جن میں طالب علم کا سنہرا کیریئر زبانوں، بالخصوص رابطے کی زبانوں میں مہارت ہی سے وابستہ ہے۔ ہم یہاں روزگار اور زندگی کے ایسے چند اہم شعبوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ تاکہ طالب علم دسویں یا بارھویں جماعت ہی سے اس کی پلاننگ کرسکیں۔

1- ترجمان (Interpreter):

یہ ایک طرح سے زبانی مترجم ہوتا ہے۔ کسی شخص کی اپنی زبان میں کہی ہوئی بات کو سامنے موجود لوگوں کی زبان میں بیان کرنے یا دہرانے کا عمل Interpreting کہلاتا ہے۔ یہ الیکٹرانک بھی ہوتا ہے اور زبانی بھی۔

انٹر پریٹر بننے کے لیے لازمی ہے کہ ایک سے زائد زبانوں چاہے مقامی ہوں یا غیر ملکی، پر عبور ہو، یادداشت اچھی ہو اور ذخیرۂ الفاظ وسیع ہو۔

2- مترجم (Translator):

مترجم بننے کے لیے دونوں زبانوں پر عبور لازم ہے، مختلف علوم وفنون کے مترجم مخصوص ہوتے ہیں۔ جن میں قانون، فنانس، مذہبیات، سیاسیات، سیاحت وغیرہ اہم ہیں۔

3- تدریس:

پیشۂ تدریس سے وابستہ ہونے کے لیے کسی ایک زبان میں مہارت کافی ہے۔ اسکولوں، کالجوں، کوچنگ سینٹرز وغیرہ میں پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوا جاسکتا ہے۔

4- صحافت:

پیشۂ صحافت سے وابستہ ہونے کے لیے دو بڑے مواقع فراہم ہیں۔ ایک الیکٹرانک میڈیا اور دوسرا پرنٹ میڈیا۔ ان دونوں میں مقامی یا غیر ملکی زبانوں میں مہارت اور بالخصوص انگریزی میں مہارت لازمی ہوتی ہے۔

5- فلم:

انگریزی، ہندی، اردو اور غیر ملکی زبانوں میں مہارت اس شعبے میں کارآمد ہے۔

6- اشاعتی شعبہ:

کتابوں، رسائل و جرائد وغیرہ کی اشاعت کے لیے ایک سے زائد زبانوں میں مہارت لازمی ہوتی ہے۔ تاکہ ترجمہ، اور ایڈیٹنگ وغیرہ کے کام انجام دیے جاسکیں۔ اس شعبے میں ایڈیٹر، کاپی رائٹر، پروف ریڈر، ٹیکنیکل رائٹر جیسے عہدے ہوتے ہیں۔

7- سیاحت:

سیر وسیاحت ایک وسیع شعبہ ہے جہاں انگریزی اور غیر ملکی زبانوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زائد زبانوں سے واقفیت کی بنا پر روزگار حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس شعبے میں فلائٹ اٹینڈنٹ، ریزرویشن اینڈ سیلز ایجنٹ، اناؤنسرز، گائیڈ جیسے عہدوں پر فائز ہوا جاسکتا ہے۔

8- ہوٹل اور کنونشن سینٹر:

یہ شعبہ ہماری روزمرّہ زندگی کا اٹوٹ حصہ بن گیا ہے۔ اس میں سیاحوں سے رابطے کا کام ہر سطح پر کیا جاتا ہے جس کے لیے انگریزی زبان اور غیر ملکی زبانوں سے واقفیت ضروری ہے۔

9- سماجی فلاحی تنظیمیں:

سماجی فلاحی تنظیموں میں کام کے لیے بھی وسیع مواقع ہیں اور ان خدمات کے لیے رابطے کی زبان، انگریزی میں مہارت ضروری ہے۔

10- بین الاقوامی سِول سروس:

بیرون ممالک کے سفارت خانوں میں ملازمت کے مواقع ایسے افراد اور پروفیشنل کے لیے وسیع ہوتے ہیں جو انگریزی کے علاوہ غیر ملکی زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔ زبانوں کے ماہرین کے تقرر میں سب سے زیادہ اقوام متحدہ آگے ہے۔ بین الاقوامی امن اور تحفظ وسلامتی کی برقراری کے لیے یہ زبانوں کے ماہرین کا تقرر بڑے پیمانے پر کرتا ہے تاکہ معاشی، سماجی، تہذیبی اور انسانیت سے متعلق مسائل کے حل کے لیے موثر خدمات انجام دی جاسکیں۔

طلبہ کو چاہیے کہ وہ دسویں جماعت سے انگریزی زبان پر خصوصی توجہ دیں۔ بارھویں جماعت تک آتے آتے روزانہ انگریزی اخبار کا مطالعہ، انگریزی کے پسندیدہ اور اساتذہ یا بڑوں کی سفارش کردہ کہانیوں اور ناولوں کا مطالعہ اپنی عادت بنالیں۔ بارھویں جماعت کے بعد کئی یونیورسٹیز میں .B.A اور .M.A انگریزی، ہندی اور اردو کے علاوہ غیر ملکی زبانوں، فرنچ، کورین، اسپینش، روسی، عربی، جاپانی، فارسی، پشتو، منگولیائی، چینی، میں کورسیز متعارف ہیں۔ جیسے دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی وغیرہ۔ ہندستان میں ملکی و غیر ملکی زبانوں کے لیے علاوہ جامعات اور جامعاتی رتبے کے دیگر مراکز مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے قائم کیے گئے ہیں جن میں سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجیز (CIEFL)، دراوڈین یونیورسٹی آندھراپردیش، سنسکرت یونیورسٹی، ہندی یونیورسٹی، اردو یونیورسٹی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر جامعات میں ریگولر یا فاصلاتی طرز میں گھر بیٹھے یہ کورسیز کیے جاسکتے ہیں۔

کیریئر کے مواقع: ان کورسیز میں کامیابی اور حصول مہارت کے بعد جن محکموں اور شعبوں میں بہترین کیریئر بنایا جاسکتا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

Govt. Foreign Services,
Cultural Embassies
Diplomatic Missions
Museums,
Foreign News Agencies,
TV/Radio Networks
Hospitality Industry
Financial Institutions,
Consultancies,
Media and Entertainment,
Health Services

نوٹ: ہر سال اپریل، مئی اور جون میں عام طور سے ان کورسیز میں داخلوں کے اعلانیے قومی اخبارات میں شائع کیے جاتے ہیں۔ جن سے استفادہ کرکے اپنا کیریئر بنایا جاسکتا ہے۔

161, Special C, Nehru Nagar, Kachiguda,
Hyderabad-500027 (A.P.)

□□□

اَسّی دن میں دنیا کا سفر

مصنف: جولِس ورن/مترجم: صفدر حسین

ایک بے حد دلچسپ ناول جس میں ایک اصول پسند اور اولوالعزم آدمی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس نے اپنے دوستوں کے ساتھ شرط لگائی تھی کہ وہ اَسّی دن میں پوری دنیا کا سفر طے کرے گا۔ 20 ہزار پونڈ کی اس شرط کو جیتنے کے لیے اس نے اس سے کئی گنا زیادہ رقم خرچ کردی۔
لیکن کیا وہ شرط جیت سکا؟
یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کریں۔

صفحات:170، قیمت:-/21روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کے حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ زیر نظر کتاب میں بڑے دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلی، ہائیڈرا، جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔
ایک بے حد دلچسپ کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔

صفحات:111، قیمت:-/17روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

شفقت علی

فرنٹ پیج

ویب ڈیزائننگ کا تعارف

فرنٹ پیج بنانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ ویب سائٹ کی منصوبہ بندی کرنے اور اس کی ظاہری شکل وصورت کو بہتر بنانے کے بارے میں سیکھیں اور یہ جان لیں کہ بہترین اور کامیاب سائٹس کی ظاہری شکل وصورت کیا ہوتی ہے اور یہ سارا عمل سیکھنے کے لیے آپ کو کچھ وقت صرف کرنا ہوگا۔ اگر آپ فرنٹ پیج شروع کرنے سے پہلے کچھ وقت اس کے لیے صرف کریں گے تو بعد کے کئی گھنٹوں (یا کئی دنوں) کا وقت بچالیں گے۔

ویب سائٹ کی منصوبہ بندی کرنا

ویب سائٹ کی منصوبہ بندی کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہ ایک ایسا مرحلہ ہے جس کے بارے میں لوگ نہیں جانتے اور جو جانتے ہیں وہ اس کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ویب سائٹ کی منصوبہ بندی بالکل مکان بنانے کی منصوبہ بندی کی طرح ہے۔ کچھ لوگ مکان بنانے کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کرتے اور تعمیر شروع کروا دیتے ہیں لیکن بعد میں انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بعض کام دوبارہ کر رہے ہیں اور ان کے پاس مناسب آلات اور میٹریل کی بھی کمی ہے۔ تاہم مناسب منصوبہ بندی سے آپ کی بہت سی ممکنہ مشکلات کا ازالہ ہو جاتا ہے جو منصوبہ بندی نہ کرنے کی صورت میں یقیناً آپ کو اٹھانی پڑیں گی۔ ذیل میں ویب سائٹ کی منصوبہ بندی کے بنیادی مراحل بتائے گئے ہیں۔

1- اپنے نظریات اور مواد کو منظم کرنا۔
2- ڈائرکٹری ڈھانچہ یا اسٹرکچر (structure) تیار کرنا جسے عرف عام میں سائٹ کا نقشہ (site mapping) کہا جاتا ہے۔
3- تیار کرنے والے صفحہ (صفحات) کا خاکہ یا اسٹوری بورڈ (story board) تیار کرنا۔
4- سائٹ کی ظاہری شکل وصورت وضع کرنا اور اس میں سدھار لانا۔

اگرچہ بیان کردہ مراحل میں بہت سی باتیں آپ کو پیچیدہ محسوس ہوں گی لیکن آپ پریشان نہ ہوں اور اس بات کا یقین رکھیں کہ جب آپ ان مراحل سے گزریں گے تو یہ آپ کو بہت آسان محسوس ہوں گے — ذیل میں ان تمام مراحل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کامیاب منصوبہ بندی کرنے کے لیے ٹوٹکے بھی مہیا کیے گئے ہیں۔

پہلا مرحلہ: ناظرین کا تعین کرنا

روزانہ سیکڑوں یا ہزاروں لوگ آپ کی ویب سائٹ کا دورہ کریں گے اور آپ کی یہ خواہش ہوگی کہ آپ کا مطلوبہ پیغام واضح طریقے سے ویب سائٹ کے ذریعے لوگوں تک پہنچے۔ یہ پیغام آپ کے خیالات، ریسرچ کے نتائج یا دوسری چیزوں پر مبنی ہوسکتا ہے۔

اس کے لیے سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ کن لوگوں کو یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ ان معلومات کے بغیر آپ مطلوبہ پیغام کی حدود کا تعین نہیں کرسکتے۔ دیا جانے والا پیغام ہی ایک بنیاد ہے جس پر ویب سائٹ بنائی جاتی ہے۔ اس لیے کسی بھی ویب سائٹ کی منصوبہ بندی میں سب سے پہلا مرحلہ اس بات کا تعین کرنا ہے کہ آپ کن لوگوں کے لیے یا کن ناظرین کے لیے ویب سائٹ بنا رہے ہیں۔

آپ کو ان باتوں کا پتہ ہونا چاہیے کہ آپ کے ناظرین کا تعلیمی بیک گراؤنڈ کیا ہے، پچھلا تجربہ کتنا ہے، ان کی دلچسپی کس میں ہے اور وہ کیوں آپ کی ویب سائٹ کا دورہ کریں گے۔ ان چیزوں کے علاوہ آپ کو یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ ناظرین کی اوسط عمر کتنی ہے، وہ جغرافیائی لحاظ سے کس علاقہ میں رہتے ہیں اور وہ ویب پر کیا چیز چاہتے ہیں۔

نیز اگر آپ ویب سائٹ کسی ذاتی اسٹیٹمنٹ یا تخلیقی تجربے کی بنیاد پر بنا رہے ہیں تو آپ اس مرحلے کو چھوڑ کر اپنی ذاتی دلچسپی اور ترجیحات کی بنیاد پر ویب سائٹ بنا سکتے ہیں۔ بصورت دیگر دیے گئے منصوبہ بندی کے تمام مراحل سے ضرور گزریں۔

آپ کس طرح ناظرین کے لیے معلومات اکٹھی کریں گے؟ اگر آپ کسی پیشہ ورانہ ماحول میں کام کر رہے ہیں تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ آپ کی بنائی گئی چیز (پروڈکٹ) یا آپ کی پیش کردہ خدمات کو استعمال کرنے والے لوگوں کے بارے میں کوئی پہلے سے معلومات اکٹھی کر چکا ہے۔ اگر کوئی ایسا سروے کر چکا ہے جو آپ کو مدد دے سکتا ہے تو اسے تلاش کریں اور نئے سرے سے تحقیق کرنے کا وقت بچائیں۔

اگر آپ یہ معلومات نہیں رکھتے یا آپ کسی اور ماحول میں ہیں تو مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھیں:

سروے کرنا

جب بھی اپنی ویب سائٹ کے ناظرین کے بارے میں تحریر کریں۔ ان

میں مندرجہ ذیل معلومات ضرور شامل کریں:

☆ عمر
☆ جنس
☆ معاشی حیثیت
☆ تعلیمی قابلیت
☆ جغرافیائی علاقہ (جس میں وہ رہتے ہیں)
☆ شادی شدہ/غیر شادی شدہ

ان کے علاوہ آپ ان لوگوں کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ کیا وہ دوست ہیں؟ رشتے دار ہیں؟ کاروباری ساتھی ہیں یا کلائنٹ ہیں؟ اس کے علاوہ مختلف پیراگراف میں یہ لکھیں کہ آپ کن لوگوں کو اپنی ویب سائٹ پر دعوت دینا چاہتے ہیں یا کون لوگ آپ کی ویب سائٹ کا دورہ کرنا پسند کریں گے۔

اس مرحلے کی تکمیل کے لیے آپ سنجیدگی سے سوچیں۔ اگر آپ اس مرحلے کا تعین نہیں کریں گے تو آپ کی ویب سائٹ سے معلومات کا حصول مشکل ہو جائے گا۔

فرض کریں کہ آپ مزاح پسند کرنے والے لوگوں کے لیے مزاح سے بھرپور ایک ویب سائٹ بناتے ہیں۔ اس ویب سائٹ سے مزاح پسند لوگ تو آسانی سے معلومات یا ڈاٹا تلاش کرلیں گے لیکن ایسے لوگوں کو جو کسی سنجیدہ موضوع پر معلومات یا کسی مسئلے کا حل تلاش کر رہے ہیں، کافی پریشانی کا سامنا ہوگا۔

گرافکس اور ملٹی میڈیا آئٹمز کے استعمال سے ویب سائٹ کی کشش بڑھتی ہے۔ ان تصاویر اور ملٹی میڈیا آئٹمز کو ہر کوئی بذریعہ لوکل ایریا نیٹ ورک (LAN) تو حاصل کرسکتا ہے لیکن اس طرح بڑی تصاویر اور ایکٹو ملٹی میڈیا آئٹمز سے ورلڈ وائیڈ ویب پر آپ سائٹ پر ڈاٹا کی آمد کی رفتار کم ہوگی۔

ناظرین کے ساتھ کامیابی سے رابطہ کرنے کے لیے پہلے یہ جان لیں کہ وہ کون ہیں اور پھر ویب سائٹ کے مختلف عناصر پر ان کے ردعمل کا جائزہ لیں۔ آپ اپنی ویب سائٹ میں ہر پہلو مثلاً فونٹس، تصاویر وغیرہ کی سیٹنگ، اپنی ویب سائٹ سے متعلقہ ناظرین کو ذہن میں رکھ کر کریں۔

دوسرا مرحلہ: حدود کا تعین اور تنظیم

ویب پیج کی ڈیزائننگ شروع کرنے سے پہلے آپ کے اس کے بارے میں نظریات درست ہونے چاہئیں۔ اس بات کا فیصلہ کرلیں آپ کی ویب سائٹ کا مقصد یا مشن کیا ہے۔ کیا آپ لوگوں کو کسی بات سے مطلع کرنا چاہتے ہیں؟ انھیں ترقی یافتہ یا تعلیم یافتہ بنانا چاہتے ہیں؟ ان تک ریسرچ یا رپورٹ پہنچانا چاہتے ہیں؟ یا ویب سائٹ کے ذریعے انھیں تفریح مہیا کرنا چاہتے ہیں؟

اگر آپ اپنی کمپنی کی ویب سائٹ بنانے جا رہے ہیں تو اس بات کا یقین کرلیں کہ یہ ویب سائٹ کمپنی کے مفاد اور مشن کی نمائندگی کرتی ہے۔ زیادہ تر کمپنیاں، حتیٰ کہ بڑی کمپنیوں کے بہت سے شعبہ جات کسی مخصوص مشن اسٹیٹمنٹ پر کام کرتے ہیں۔ آپ ان مشن اسٹیٹمنٹ میں سے کسی ایک کی بنیاد پر ویب سائٹ بناسکتے ہیں۔

اپنی سائٹ کے لیے مشن اسٹیٹمنٹ لکھنے کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کا خیال رکھیں:

☆ آپ کی کمپنی ویب سائٹ پر یا عام طور پر کون سی آئٹم یا خدمات پیش کرتی ہیں؟
☆ آپ کے (یا آپ کی کمپنی کے) تین سے پانچ تک کن مقاصد کی تکمیل کے لیے آپ نے منصوبہ بندی کی ہے؟ (عمومی طور پر یہ مقاصد معلومات پہنچانا، تفریح فراہم کرنا، چیزیں بیچنا، ترقی کرنا، تقسیم کرنا یا ریسرچ یا رپورٹ پہنچانا ہیں۔ زیادہ تر سائٹس ان تمام یا اس سے زیادہ مقاصد کے لیے کام کرتی ہیں۔)
☆ کیا آپ کی تصویر یا سائٹ کی تصویر کو بیان کرنے کے لیے کچھ الفاظ یا ایک چھوٹا فقرہ استعمال کیا جاسکتا ہے؟
☆ سائٹ کو کن ناظرین کی بنیاد تک پہنچنا چاہیے؟
☆ کیا سائٹ خود ہی استعمال کنندگان تک پہنچنے یا مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کے لیے مدد فراہم کرتی ہے؟
☆ آپ کی سائٹ کے مقاصد اور استعمال کنندگان کی پسند کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور آپ کے بجٹ کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے سائٹ میں استعمال ہونے والی کس قسم کی چیزیں اور ٹیکنالوجی میسر ہے؟
☆ آپ یا آپ کی کمپنی کس طرح اپنی ویب سائٹ کی کامیابی کا پتہ چلائیں گے؟— اوپر بیان کردہ تمام نقاط کی روشنی میں اپنی ویب سائٹ کی مشن اسٹیٹمنٹ کا تعین کریں اور اسے کاغذ پر لکھ لیں نیز اس اسٹیٹمنٹ کو مختصر رکھیں۔

منظم کرنا

اب آپ اپنی تمام چیزوں کو منظم کریں گے۔ تمام مطلوبہ ڈاکومنٹس اور تصاویر کو اکٹھا کر کے رکھ لیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ ذاتی سائٹ بنا رہے ہیں تو تمام لکھے مواد اور آرٹ ورک کو اکٹھا کرلیں اور اگر آپ اپنی کمپنی کی سائٹ بنا رہے ہیں تو کمپنی کا لوگو، کمپنی کی معلومات اور پراڈکٹ کی تفصیل پر مشتمل ڈاکومنٹس یا دستاویزات اکٹھی کرلیں۔

اب آپ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے پہنچائے جانے والے پیغام، استعمال ہونے والی تصاویر اور تحریر کے بارے میں سوچیں۔ اگر آپ کی سائٹ کا مقصد تفریح فراہم کرنا ہے تو ہلکے پھلکے فقرات اور مزاحیہ تصاویر ٹھیک رہیں گی، جبکہ ایک سنجیدہ ویب سائٹ میں مکمل طور پر ٹھیک لینگویج اور پر تاثر تصاویر استعمال ہوں گی۔

ایم نسیم اعظمی کوئز

تعلیم

(1) ٹکشلا اور نالندہ کی قدیم یونیورسٹیوں میں داخلہ ٹسٹ لیتا تھا؟
(الف) منتظم اعلا (ب) مٹھیہ گرو
(ج) دوار پنڈت (د) بھکشا ادھیکاری

(2) بودھ دھرم میں پبجا کی رسم ادا کی جاتی تھی؟
(الف) فراغت کے وقت (ب) داخلے کے وقت
(ج) تعلیمی ترقی کے وقت (د) کبھی بھی

(3) اُپ نین کی تعلیمی رسم ادا کی جاتی تھی؟
(الف) بودھ دھرم میں (ب) جین دھرم میں
(ج) ہندو دھرم میں (د) سکھ دھرم میں

(4) مسلمانوں میں رسم بسم اللہ کا رواج تھا، جب بچے کی عمر ہوتی تھی؟
(الف) 6 سال (ب) 5 سال
(ج) 4 سال 4 مہینے 4 دن (د) 5 سال 6 مہینے 6 دن

(5) ''تعلیم کی نہ تو ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا'' یہ کس کا قول ہے؟
(الف) راجا رام موہن رائے (ب) سرسید احمد خاں
(ج) مہاتما گاندھی (د) جواہر لعل نہرو

(6) ''ہندوؤں کی پرانی تعلیم منگتا پنڈت اور مسلمانوں کی قدیم تعلیم فاتحہ خوانی کی روٹی کھانے والا ملا پیدا کرتی ہے۔'' یہ کس نے کہا تھا؟
(الف) سرسید احمد خاں (ب) راجا رام موہن رائے
(ج) مولوی عبدالرحیم (د) مولوی نذیر احمد

(7) آزاد ہندستان کے پہلے وزیر تعلیم تھے:
(الف) سردار پٹیل (ب) ڈاکٹر سمپورنا نند
(ج) مولانا حسرت موہانی (د) مولانا ابوالکلام آزاد

(8) کس مذہب میں تمام مرد و عورت کے لیے تعلیم کو فرض قرار دیا گیا ہے؟
(الف) عیسائی مذہب میں (ب) یہودی مذہب میں
(ج) ہندو مذہب میں (د) اسلام مذہب میں

(9) نیشنل ٹیچر ایجوکیشن کونسل کے قیام کے لیے پہلا قانون منظور ہوا
(الف) 1961 میں (ب) 1985 میں
(ج) 1995 میں (د) 2001 میں

(10) ٹیچر ٹریننگ کی خاص بنیاد ہے
(الف) طلبہ کو زیادہ تعداد میں داخلہ اور تعلیم دینا
(ب) خواتین ٹیچروں کو تربیت دینا
(ج) دیہی علاقوں میں اسکول قائم کرنا
(د) سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں سے رابطہ قائم کرنا

(11) غیر رسمی تعلیم میں جانکاری کا ذریعہ ہیں:
(الف) کتابیں (ب) مقامی ضرورتیں
(ج) جمہوریت میں حصے داری (د) مذکورہ سبھی

(12) ہندستانی تعلیم میں 3+2+10 کی سفارش کس تعلیمی کمیشن نے کی تھی؟
(الف) کوٹھاری کمیشن نے
(ب) مدالیئر کمیشن نے
(ج) ڈاکٹر رادھا کرشنن کمیشن نے
(د) رام مورتی کمیٹی نے

(13) واردھا تعلیمی اسکیم میں خاص زور دیا گیا تھا:
(الف) مادری زبان کی تعلیم پر
(ب) سنسکرت اور فارسی تعلیم پر
(ج) دستکاری اور بچوں کی نشو و نما پر
(د) آرٹ، رقص اور موسیقی کی تعلیم پر

(14) ہر سال یوم اساتذہ منایا جاتا ہے اور اساتذہ کو انعامات سے نوازا جاتا ہے:
(الف) 14 نومبر کو (ب) 5 ستمبر کو
(ج) 2 اکتوبر کو (د) 26 جنوری کو

(15) آزاد ہندستان کے پہلے تعلیمی کمیشن کا نام تھا:
(الف) مدالیئر کمیشن (ب) کوٹھاری کمیشن
(ج) ڈاکٹر رادھا کرشنن کمیشن (د) ہنٹر کمیشن

(16) ہندستانی تعلیم کا میگنا کارٹا کس کو کہا جاتا ہے؟
(الف) گوکھلے بل کو (ب) کوٹھاری کمیشن کو
(ج) ایڈم رپورٹ کو (د) وُوڈ ڈسپیچ کو

(17) تعلیمی اصطلاح میں کسی طالب علم کا ایک ہی درجے میں ایک سال سے زائد رہنا کہلاتا ہے:
(الف) وقت کا زیاں (ب) جمود
(ج) خراب تدریس (د) تعلیم سے عدم دلچسپی

(18) بھارت میں صد فیصد تعلیم یافتہ ضلع ہے:
(الف) الہ آباد (ب) پٹنہ
(ج) بیکانیر (د) ارناکولم

(19) جدید تعلیم میں سیکولرزم کا اصول کس کی دین ہے؟
(الف) جواہر لعل نہرو کی (ب) مہاتما گاندھی کی
(ج) مسٹر ایڈم کی (د) ڈیوڈ ہیمبر کی

(20) انڈین یونیورسٹیز کمیشن کا قیام کیا تھا؟
(الف) لارڈ ڈلہوزی نے (ب) لارڈ کرزن نے
(ج) ولیم ہنٹنگ نے (د) لارڈ رپن نے

(21) 1916-21 میں قائم ہونے والی دو یونیورسٹیوں کے ناموں کی ترتیب ہے:
(الف) بنارس ہندو یونیورسٹی۔ میسور یونیورسٹی
(ب) پٹنہ یونیورسٹی۔ گورکھپور یونیورسٹی
(ج) علی گڑھ یونیورسٹی۔ عثمانیہ یونیورسٹی
(د) دہلی یونیورسٹی۔ پنجاب یونیورسٹی

(22) عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام کب عمل میں آیا؟
(الف) 1918 میں (ب) 1920 میں
(ج) 1916 میں (د) 1919 میں

(23) ڈاکٹر سید محمود کس صوبے کے وزیر تعلیم تھے؟
(الف) جموں کشمیر کے (ب) مغربی بنگال کے
(ج) آندھرا پردیش (د) بہار کے

(24) دستور ہند کی کس دفعہ کے تحت اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کے قیام کا حق حاصل ہے؟
(الف) دفعہ 29 (ب) دفعہ 30
(ج) دفعہ 28 (د) دفعہ 33

(25) مدالیر کمیشن کا قیام ہوا تھا:
(الف) 1947 میں (ب) 1948 میں
(ج) 1952 میں (د) 1960 میں

(26) پہلے پنج سالہ منصوبے میں تعلیم پر کل کتنے اخراجات ہوئے تھے؟
(الف) 153 کروڑ روپے (ب) 200 کروڑ روپے
(ج) 135 کروڑ روپے (د) 165 کروڑ روپے

(27) نویں پنج سالہ منصوبے میں تعلیمی اخراجات کا 58% خرچ کیا گیا ہے؟
(الف) ثانوی تعلیم پر (ب) ابتدائی تعلیم پر
(ج) تکنیکی تعلیم پر (د) اعلا تعلیم پر

(28) ندوۃ العلما لکھنؤ کا قیام ہوا تھا:
(الف) 1857 میں (ب) 1877 میں
(ج) 1898 میں (د) 1902 میں

(29) دینی تعلیمی کونسل کس ریاست کے مسلمانوں کی تعلیمی تنظیم ہے؟
(الف) بہار (ب) مہاراشٹر
(ج) کرناٹک (د) اتر پردیش

(30) کس صوبے کے اردو میڈیم اسکولوں کا نتیجہ سب سے زیادہ اطمینان بخش رہتا ہے؟
(الف) دہلی (ب) بہار
(ج) مہاراشٹر (د) آندھرا پردیش

(31) "یہ کچی عمر کے بچے تو گیلی مٹی ہیں انھیں جو چاہو بنا دو کمہار کی صورت"
اظہر انصاری کا یہ شعر کس تعلیمی مفکر کے تعلیمی نظریے کی تائید کرتا ہے؟
(الف) افلاطون (ب) جان لاک
(ج) روسو (د) جان ڈیوی

(32) وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں جس علم کا حاصل ہو جہاں میں دو کف جو
یہ کس کا شعر ہے؟
(الف) علامہ اقبال کا (ب) مرزا غالب کا
(ج) علامہ شبلی نعمانی کا (د) اکبر الہ آبادی کا

(33) "ہر فرد میں سیکھنے اور نشو ونما پانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔"
یہ کس نے کہا تھا؟
(الف) روسو نے (ب) مہاتما گاندھی نے
(ج) سرسید احمد خاں نے (د) مادام مانٹے سوری نے

(34) تعلیم برائے روزگار کے علمبردار تھے:
(الف) فریڈرل فروبل (ب) ہربرٹ اسپنسر
(ج) جان ڈیوی (د) راجا رام موہن رائے

(35) تصور عینیت کے ماننے والے قائل ہیں:
(الف) ذہن کے (ب) جسم کے
(ج) شخصیت کے (د) فطرت کے

(36) "اے لوگو! انسان بنو۔ تمھارا سب سے پہلا فرض ہے کہ تم انسان بنو۔ تم بچوں سے پیار کرو، ان کے کھیلوں ان کی خوشیوں، ان کی دل آویز جبلتوں کی ہمت افزائی کرو۔" یہ کس کا قول ہے؟
(الف) مہاتما گاندھی کا (ب) جان لاک کا

(ج) جواہر لعل نہرو کا (د) روسو کا

(37) "مجھے بچوں کو پڑھا کر وہی خوشی ہوتی ہے جو مچھلی کو پانی اور چڑیا کو ہوا سے ہوتی ہوگی" یہ کس نے کہا تھا؟

(الف) فریڈرل فروبل نے (ب) ولیم ایلم نے

(ج) مادام مانٹے سوری نے (د) ڈاکٹر رادھا کرشنن نے

(38) "زندگی بسر کرنے کے لیے سائنس دوسرے تمام علوم کے مقابلے میں زیادہ اہم اور مفید ہے" یہ کس کا قول ہے؟

(الف) پروفیسر عبدالسلام کا (ب) اے. پی. جے عبدالکلام کا

(ج) راجا رام موہن رائے کا (د) ہربرٹ اسپنسر کا

(39) یہ کس نے کہا تھا کہ "ضعیف العقل بچوں کی زندگی کا مسئلہ محض طبی نہیں بلکہ تعلیمی بھی ہے۔ ہمیں ان کی تعلیم پر زیادہ توجہ دینی چاہیے۔"

(الف) علامہ اقبال نے (ب) مادام مانٹے سوری نے

(ج) جان ڈیوی نے (د) ڈاکٹر ذاکر حسین نے

(40) "شانتی نکیتن انسانی وحدت کا نمونہ ہے" یہ کس نے کہا تھا؟

(الف) جواہر لعل نہرو نے (ب) فراق گورکھپوری نے

(ج) ذاکر حسین نے (د) پروفیسر مجیب نے

(41) یہ کس کا قول ہے کہ "تعلیم کے تین موثر ذرائع فطرت، زندگی اور استاد ہیں۔"

(الف) ارسطو کا (ب) سید عابد حسین کا

(ج) شبلی نعمانی کا (د) رابندر ناتھ ٹیگور کا

(42) سابرمتی آشرم اور سیوا گرام آشرم قائم کیا تھا؟

(الف) مہاتما گاندھی نے (ب) مدر ٹریسا نے

(ج) آچاریہ ونوبھاوے نے (د) مدن موہن مالویہ نے

(43) این. سی. پی. یو. ایل. (NCPUL) مخفف ہے

(الف) نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لٹریچر

(ب) نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو لینگویج

(ج) نیشنل کارپوریشن فار پروموشن آف اردو لینگویج

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(44) این. سی. ای. آر. ٹی. (NCERT) کس کا مخفف ہے؟

(الف) نیشنل کارپوریشن آف ایجوکیشن ریسرچ ٹریننگ

(ب) نیشنل کونسل آف الکٹرانک ریسرچ ٹریننگ

(ج) نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(45) مولانا آزاد نیشنل اوپن اردو یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر کا نام ہے؟

(الف) سید حامد (ب) پروفیسر اے. ایم. پٹھان

(ج) پروفیسر عبدالمغنی (د) پروفیسر شمیم جیراجپوری

(46) ایکس. آئی. آر. ٹی. (XIRT) کس شہر میں قائم ہے؟

(الف) پٹنہ میں (ب) کلکتہ میں

(ج) جمشید پور میں (د) دہلی میں

(47) انسٹی ٹیوٹ آف رورل مینجمنٹ (IRM) کن دو شہروں میں واقع ہے؟

(الف) دہلی اور لکھنؤ میں (ب) کلکتہ اور چنڈی گڑھ میں

(ج) بنگلور اور حیدر آباد میں (د) چینئی اور آنند پور میں

(48) بزنس مینجمنٹ کا مراسلاتی کورس کون سی یونیورسٹی صرف فوجیوں کے لیے چلاتی ہے؟

(الف) اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی

(ب) مولانا آزاد نیشنل اوپن اردو یونیورسٹی

(ج) پنجابی یونیورسٹی

(د) جواہر لعل نہرو یونیورسٹی

(49) 1983 میں اردو مادری زبان والے طلبہ کی تعلیم اردو میڈیم سے دلانے کی سفارش کی تھی:

(الف) آل احمد سرور تعلیمی کمیٹی نے

(ب) گوپال داس تعلیمی کمیٹی نے

(ج) سرکاریہ کمیشن نے

(د) علی سردار جعفری کمیٹی نے

(50) درس نظامیہ کے نصاب کو "خود ردورس" کہا تھا:

(الف) مولانا شاہ سلیمان پھلواروی نے

(ب) سرسید احمد خاں نے

(ج) مولوی نذیر احمد نے

(د) مولانا محمد قاسم نے

(51) اگنو (IGNOU) مخفف ہے:

(الف) اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کا

(ب) انڈین گورنمنٹ نیو اوپن یونیورسٹی کا

(ج) اندرا گاندھی نیو اوپن یونیورسٹی کا

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(52) بی. آئی. ٹی. (BIT) کا فل فارم ہے:

(الف) بیچلر آف انڈین ٹکنالوجی (ب) بیچلر آف انفارمیشن ٹکنالوجی

(ج) بیچلر ان انڈین ٹکنکس (د) بیچلر آف انڈسٹریل ٹکنالوجی

(53) ایم.اے.ڈی.ای. (MADE) کا فل فارم ہے:

(الف) ماسٹر آف آرٹ ان ڈسٹینس ایجوکیشن

(ب) ماسٹر آف آرٹ ڈیولپمنٹ ایجوکیشن

(ج) ماسٹر آف ایڈورٹزمنٹ ڈسٹینس ایجوکیشن

(د) ماسٹر آف ایڈوانس ڈسٹینس ایجوکیشن

(54) ایم.ایل.آئی.ایس.سی. (MLISC) مخفف ہے:

(الف) ماسٹر آف لینگویج انفارمیشن سائنس کا

(ب) ماسٹر آف لیگل انفارمیشن سائنس کا

(ج) ماسٹر آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس کا

(د) ماسٹر آف لٹریچر اینڈ انفارمیشن سائنس کا

(55) 1947 میں ہندستان میں یونیورسٹیوں کی تعداد کتنی تھی؟

(الف) 25 (ب) 30

(ج) 19 (د) 29

(56) آل انڈیا قانونی تعلیمی بورڈ کا قیام کب ہوا تھا؟

(الف) 1955 میں (ب) 1947 میں

(ج) 1960 میں (د) 1965 میں

(57) ہندستان میں انگریزی تعلیم اور مغربی سائنس وادب کے اولین حامی تھے:

(الف) مسٹر ایڈم (ب) راجہ رام موہن رائے

(ج) راج گوپال آچاریہ (د) مولوی عبدالرحیم

(58) ریاست اتر پردیش کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے:

(الف) آگرہ یونیورسٹی (ب) بنارس ہندو یونیورسٹی

(ج) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (د) الہ آباد یونیورسٹی

(59) 2001 کی مردم شماری کے مطابق کس ریاست کی شرح خواندگی سب سے کم ہے؟

(الف) اتر پردیش کی (ب) بہار کی

(ج) اڑیسہ کی (د) میزورم کی

"Adeela Publication", Doman Pura (Kasari), Maunath Bhanjan (U.P.) 275101

□□□

گاندھی کی کہانی

مصنف: راجکماری شنکر/مترجم: نامی انصاری

اس کتاب میں بابائے قوم کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ ہندستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ بھی عام فہم زبان میں درج کی گئی ہے۔ گاندھی جی اور ان سے متعلق دیگر افراد کی تصویریں بھی کتاب میں موجود ہیں۔

صفحات: 120، قیمت: -/35 روپے

بچوں کے نہرو

ایم. چالاپاتھی راؤ/مترجم: نامی انصاری

پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور اس لیے بچے انھیں چاچا نہرو کہتے تھے۔ اس کتاب میں جدید ہندستان کے اس معمار کی حیات اور شخصیت کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 112، قیمت: -/32 روپے

اندرا پریہ درشنی

مصنفہ: اکا شنکر/مترجم: بشیق مظفر پوری

اس کتاب میں تقریباً تین دہائیوں تک ہندستانی سیاست پر چھائی رہنے والی اندرا گاندھی کی شخصیت اور زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 142، قیمت: 45 روپے

شنکر

مصنفہ: اکا شنکر/مترجم: انیس اعظمی

ملک کے مایۂ ناز کارٹونسٹ کیشو شنکر پلئی کی سوانح، جو دلچسپ بھی ہے اور حوصلہ بخشنے والی بھی۔

صفحات: 128، قیمت: -/35 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد سہیم الدین

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-12

بڑھتے قدم

حفظ الرحمان نے، جن کے والد ایک مدرسے میں معلم ہیں اور جنھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی، بعد ازاں دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے عالمیت کیا اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے بی. اے. آنرز (عربک) اور یونیورسٹی آف دہلی سے ایم. اے. (عربک) مکمل کیا۔ ایم. اے. کے دوران ہی انھوں نے کونسل کا ایک سالہ ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کورس کیا اور اس کورس کی وجہ سے ابھی ادبھو (UDBHAV) کمپیوٹر پرائیویٹ لمیٹڈ میں ایک پروجیکٹ کے تحت جو ICCR میں چل رہا ہے، Digitisation کے کام پر مامور ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب اعلا تعلیم کے لیے لکھنؤ آنا ہوا اور پہلی مرتبہ ریلوے ریزرویشن کاؤنٹر پر کمپیوٹر دیکھا تو یہ انوکھی چیز لگی، اسی وقت دل میں تمنا جاگ اٹھی کہ میں بھی کمپیوٹر کی تعلیم سے بہرہ ور رہوں، یہی شوق تھا، جو کمپیوٹر سے دلچسپی کا ذریعہ بنا اور یہ دلچسپی آخر کار کمپیوٹر کی تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے ذریعے چلائے جارہے سنٹرز دوسرے انسٹی ٹیوشن سے بہت زیادہ مختلف اس وجہ سے ہیں کہ ان کے ذریعے اردو داں طلبہ کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا ہے اور اردو معلمین کے اندر کمپیوٹر ایجوکیشن سے متعلق جو ناامیدیاں تھیں، اس یاس و ناامیدی کو اس نے امید میں اور بے اعتمادی کو خود اعتمادی میں بدل دیا۔ یقیناً یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو اب کسی سے مخفی نہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں قومی اردو کونسل کے سینٹروں میں دی جارہی تعلیم سے سو فیصد مطمئن ہوں۔ ابتداً نصاب میں جو کچھ کمی تھی وہ بھی اب اضافہ شدہ اور جدید نصاب نے پوری کر دی ہے۔ اب کم از کم میرے علم کے مطابق کوئی کمی نہیں ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے ذریعے چلایا جارہا کورس اردو داں طلبہ میں نہ صرف خود اعتمادی پیدا کر رہا ہے بلکہ روزگار سے جوڑنے کا کام بھی کر رہا ہے۔ چونکہ آج بھی اردو داں افراد کے لیے اردو پیکج کے ساتھ کمپیوٹر کی تعلیم کا انتظام کسی دوسرے ادارے میں مکمل طور پر نہیں ہے۔ اس لیے کونسل کا کمپیوٹر کورس اپنے آپ میں اردو داں طبقے کے لیے حصولِ معاش کا ضامن ہے اور اب جبکہ خط و کتابت سے لے کر طباعت و اشاعت کا سارا کام کمپیوٹر کے ذریعے ہونے لگا ہے، کونسل کے سینٹروں سے فارغین کے لیے ایک سنہرا موقع ہے جو فراہمیِ روزگار میں پوری طرح معاون ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر اپنے آپ میں ایک امنگ اور کیف محسوس ہو رہا ہے، زندگی میں امید کی کرن نظر آنے لگی ہے۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: ایک بہت بڑی تبدیلی، ایک انقلاب، I.T. کے میدان میں آگے بڑھنے کی راہ کو ہموار پا کر مسرت و شادمانی اور خود اعتمادی کا احساس ہو رہا ہے۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: ملٹی لنگول ہونے کی وجہ سے کورس مکمل کرنے کے بعد میں نے اپنے اندر جو خود اعتمادی محسوس کی تھی اس کا خاطر خواہ ریٹرن مجھے مل رہا ہے اور مارکیٹ میں اپنے آپ کو ہندستانی سطح پر مشہور Institute سے فارغین کے مقابلے میں خود کو ممتاز محسوس کر رہا ہوں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: بہت ہی معمولی فیس ہے، اسے کوئی بھی آج کے اس مہنگائی کے دور میں جبکہ طلبہ موٹی موٹی رقم دے کر کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں دے سکتا ہے۔ بلکہ یہ فیس معاشی طور پر کمزور طلبہ کے لیے بھی مناسب اور موزوں ہے۔

□□□

اردو خبرنامہ

قلی قطب شاہ تقاریب

● حیدرآباد، 16 رمئی۔ "ایران اور ہندستان کے تعلقات صدیوں قدیم ہیں۔ ہندستان میں بہمنی اور قطب شاہی خاندان کے لوگ ملک گیری کے جذبے کے تحت نہیں آئے۔ انھوں نے ہندستان میں تہذیبی، ثقافتی اور فنی کارنامے انجام دیے۔" جناب حسین راوش کونسلر جنرل، اسلامی جمہوریہ ایران نے 44ویں یوم قلی قطب شاہ تقاریب کے موقعے پر ان خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب کا اہتمام ادارہ ادبیات اردو نے کیا تھا جس کی صدارت جناب ابراہیم بن عبداللہ مسقطی صدرنشیں، اردو اکادمی، آندھراپردیش نے کی۔ جناب حسین راوش نے مزید کہا کہ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں ایرانی تہذیب وثقافت حیدرآباد کی تہذیب وثقافت میں شامل ہوئی۔ جناب ابراہیم بن عبداللہ مسقطی نے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ اگرچہ ایرانی تھے لیکن انھوں نے ایک اجنبی سرزمین، اجنبی ماحول وتہذیب وزبان کے ماحول میں جس پیار ومحبت کے ساتھ حکومت کی وہ دورِحاضر کے حکمرانوں کے لیے سبق ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ انھوں نے بلاتفریق زبان ومذہب تمام ادیبوں، شعرا، فن کاروں کی نہ صرف قدر کی بلکہ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ سمجھنا انتہائی غلط ہے کہ اردو ختم ہورہی ہے اور اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج سے ایک صدی قبل اردو صرف برِصغیر ہند تک محدود تھی لیکن آج 170 ممالک میں بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ جناب صفی الدین قادری، شریک معتمد نے ادارہ ادبیاتِ اردو کی سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ پیش کی۔ ممتاز گلوکار رکن الدین نے محمد قلی قطب شاہ کی مناجات ساز پر پیش کی۔ اس موقعے پر معززینِ شہر، ادب دوست مرد وخواتین کی کثیر تعداد موجود تھی جن میں پروفیسر اکبر علی بیگ، عبدالکریم خاں، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، بشیرالدین فاروقی ڈپٹی ڈی ای او، ڈاکٹر محمد اعظم خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ جناب منظور احمد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (سیاست، حیدرآباد)

"اردو تعلیم وتدریس" پر سیمینار

● سولن، یکم اپریل۔ اردو تدریسی وتعلیمی مرکز، سولن (ہماچل پردیش) نے "اردو تعلیم وتدریس" کے موضوع پر دو روزہ سیمینار منعقد کیا۔ سیمینار کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر خطیب سید مصطفیٰ نے سیمینار کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی۔

سیمینار میں جو مقالے پڑھے گئے ان کی فہرست درج ذیل ہے:

اکیسویں صدی میں اردو زبان کے مسائل۔ ڈاکٹر رضا حیدر، شہر حیدرآباد میں اردو تعلیم وتدریس کے مسائل۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، اردو تدریس میں طریقۂ بحث۔ ڈاکٹر مظفر شہ میری، اوپن یونیورسٹی اور اردو تعلیم کی نئی جہتیں۔ ڈاکٹر قاسم علی خاں، انجمن کی چار کتابیں۔ تلفظ واملا کا مسئلہ۔ پروفیسر اشرف رفیع، پوسٹ گریجویٹ لیول پر اردو میں درس وتدریس۔ پروفیسر خورشید احمد صدیقی، ہندستان میں اردو کے مسائل اور قومی اردو کونسل کا رول۔ ڈاکٹر ابوالکلام، ڈگری سطح پر اردو تدریس کے مسائل۔ پروفیسر محمد انوارالدین، ہماچل پردیش میں آزادی کے بعد اردو تدریس کی صورتِ حال۔ ڈاکٹر جوگ راج، اردو تدریس کے کچھ غور طلب نکات۔ ڈاکٹر شباب للت، مضمون یا ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے مستقبل میں اردو تعلیم کے امکانات۔ ڈاکٹر سراج اجملی، ریاستِ گوا میں ابتدائی تعلیم کے حوالے سے اردو کے مسائل۔ جناب تاج الدین شیخ، اردو تعلیم، کیفیت اور تدابیر۔ جناب عثمان شاہد، "Problems faced by Urdu in educational scenario of india: with special reference to post-independence era" ڈاکٹر نثار احمد کوکا، "Language preference of Urdu speakers in education" پروفیسر اوم کارناتھ کول۔

اس دو روزہ سیمینار میں مذکورہ مقالہ نگاروں کے علاوہ کرناٹک، گوا، آندھرا پردیش، ہماچل پردیش، پنجاب اور دہلی کے متعدد اساتذہ نے شرکت کی۔ سیمینار کے اختتام پر اردو تدریسی وتحقیقی مرکز، سولن کے پرنسپل ڈاکٹر جوگ راج نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

اسکرپٹ رائٹنگ پر ورک شاپ

● علی گڑھ، 26 رمئی۔ "آڈیو ویژول میڈیم کی اسکرپٹ رائٹنگ کے لیے زبان کا علم اور انسانی جذبات سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اسکرپٹ رائٹنگ کی مقبولیت اردو کے علم پر بڑی حد تک منحصر ہے۔" ان خیالات کا اظہار اردو کے ممتاز شاعر پروفیسر شہریار نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت وعوامی ترسیل اور اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر حکومتِ ہند کے مشترکہ طور پر منعقدہ اسکرپٹ رائٹنگ پر دس روزہ ورک شاپ کے افتتاح کے دوران کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسکرپٹ رائٹنگ جو فلم سے لے کر ٹی وی اور صحافت سے براہِ راست وابستہ ہے، اس میں روزگار کے مناسب مواقع موجود ہیں اور طلبہ اس میں کمال

حاصل کر کے اپنا مستقبل روشن کر سکتے ہیں۔اردو کے ممتاز کہانی نویس اور اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کے پرنسپل ڈاکٹر غضنفر علی نے کہا کہ ان کے ادارے کا اصل مقصد اردو جاننے والوں کو اسکرپٹ رائٹنگ کے مختلف فنون سے واقف کرانا ہے۔انھوں نے کہا کہ ٹی وی چینلوں کی مقبولیت بھی بڑی حد تک اسکرپٹ پر منحصر ہے اور اسکرپٹ رائٹنگ میں اردو کا قائدانہ کردار رہتا ہے۔پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے سرسید اکادمی کے سابق ڈائرکٹر اور ڈرامہ نویس پروفیسر افتخار عالم نے کہا کہ اسکرپٹ رائٹنگ کا میدان کافی وسیع ہے اور اس میں آزادانہ طور پر کام کیا جاسکتا ہے۔انھوں نے کہا کہ ترسیل اور کمیونی کیشن ایسی تکنیکیں ہیں جن سے واقف ہوئے بغیر کوئی شخص ترقی نہیں کرسکتا۔اس موقعے پر پروفیسر این اے کے درانی، پروفیسر آصف نقوی، پروفیسر خورشید احمد اور آفرینہ رضوی بھی خصوصی طور پر موجود تھے۔

4رجون کو ورکشاپ کی اختتامی تقریب منعقد ہوئی جس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ زبان کے ہر شعبے میں مہارت حاصل کیے بغیر منظرنامہ لکھنے میں مہارت حاصل نہیں کی جاسکتی ہے۔تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر ایف.ایس.شیرانی نے کہا کہ اردو میں منظرنامہ لکھنے کے لامحدود مواقع ہیں اور اردو زبان اور تہذیب کو جانے بغیر منظرنامہ تحریر کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔

پروفیسر این اے۔کے درانی نے کہا کہ ہندستانی فلموں میں منظرنامہ اور مکالمات لکھنے کے لیے اردو کا علم نہایت ضروری ہے۔انھوں نے کہا کہ پرانے منظرنگار اردو سے اچھی طرح واقف ہوتے تھے اس لیے فلمیں زیادہ معیاری ہوتی تھیں۔

شعبے کے سربراہ ایم شافع قدوائی نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔اس ورکشاپ میں طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''بیسویں صدی میں بنگال کے مسلمان'' سیمنار

● کولکاتہ،29رمارچ۔مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتہ کی صد سالہ تقریبات کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کلیم الدین شمس وزیر خوراک مغربی بنگال نے کی۔مہمانان خصوصی مغربی بنگال کے وزرا محمد امین عبدالرزاق مُلّا، شری امر چودھری، محمد سلیم، حفیظ عالم، جسٹس یوسف، پروفیسر اعزاز افضل، پروفیسر نثار احمد فاروقی، پروفیسر مظفر حنفی اور ''آزاد ہند'' کے مدیر احمد سعید ملیح آبادی تھے۔اس موقعے پر تمام مقررین نے مسلمانان بنگال کی مختلف شعبہ ہائے حیات میں انجام دی گئی نمایاں خدمات پر مفصل روشنی ڈالی۔28رمارچ کو سمینار کے پہلے دور کی صدارت ڈاکٹر قمرالدین نے کی۔جنرل سکریٹری پروفیسر سلیمان خورشید کی افتتاحی تقریر کے بعد پروفیسر گپتا، پروفیسر مکھوپادھیائے، پروفیسر بھٹاچاریہ، رنبیر سادور، ڈاکٹر دبیر احمد، پروفیسر قیصر شمیم، شمشیر عالم، نوشاد مومن، ڈاکٹر عمر غزالی، ڈاکٹر تسنیم اختر، ڈاکٹر کلیم حاذق اور ڈاکٹر محمد کاظم نے مقالات پیش کیے۔تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے کی۔اس میں ڈاکٹر مشتاق اعظمی، پروفیسر رنجیت سنگھ، عبدالغفور شہباز، ڈاکٹر شمیم انور، ڈاکٹر عبدالباری، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید اور پروفیسر مظفر حنفی نے مقالات پیش کیے۔اختتامی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مظفر حنفی نے کی اور مولانا آزاد پر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی اور منور رانا پر ڈاکٹر محبوب راہی نے مقالات پیش کیے۔اس موقعے پر انیس رفیع (افسانہ نگار) مہمان خصوصی تھے۔رات میں مشاعرہ زیر صدارت پروفیسر اعزاز افضل انعقاد پذیر ہوا جس میں نمائندہ مقامی شعرا کے علاوہ ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر محبوب راہی، راحت اندوری، کنور جاوید، جمیل خیرآبادی، اناد ہلوی، آصف اختر، حبیب ہاشمی، بازغ بہاری اور انجم عظیم آبادی نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

پروفیسر مشیر الحسن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نئے وائس چانسلر

● نئی دہلی،10 جون۔ممتاز تاریخ داں پروفیسر مشیر الحسن نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نئے وائس چانسلر کے طور پر عہدہ سنبھال لیا ہے۔انھوں نے سید شاہد مہدی کی جگہ لی ہے جو حال ہی میں سبک دوش ہوئے ہیں۔

پروفیسر حسن ایک ممتاز ماہر تعلیم ہیں اور اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اکادمی آف تھرڈ ورلڈ اسٹڈیز میں ماڈرن انڈین ہسٹری کے پروفیسر اور ڈائرکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔وہ اس یونیورسٹی کے فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجیز کے ڈین، پرو وائس چانسلر اور کارگزار وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔اس کے علاوہ پروفیسر حسن نے ہندستان میں اسلامیات، تقسیم ہند اور فرقہ وارانہ مسائل کے موضوع پر کئی کتابیں مرتب وشائع کی ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پروفیسر شرف عالم عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر

● فارسی کے ممتاز اسکالر پروفیسر محمد شرف عالم کو مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا ہے۔انھوں نے پچھلے ہفتے اپنے عہدے کا چارج لیا ہے۔اس سے پہلے ڈاکٹر شرف عالم پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے پروفیسر وصدر کے عہدے پر فائز تھے۔موصوف پٹنہ یونیورسٹی کے علاوہ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں جیسے جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی، دربھنگہ یونیورسٹی، امراوتی یونیورسٹی، ناگپور یونیورسٹی کے فارسی بورڈ آف اسٹڈیز سے بھی وابستہ ہیں۔مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی کو پانچ برس پہلے بہار کی صوبائی سرکار نے فارسی وعربی زبان وادب کی ترویج واشاعت کی غرض سے قائم کیا تھا۔

(ڈاک سے)

''عرفان صدیقی — فکر و فن'' مذاکرہ

● لکھنؤ، 18 رمئی۔ معروف شاعر عرفان صدیقی کے فکر وفن پر ایک مذاکرہ ہوا جس کی صدارت انجم ملیح آبادی نے کی۔ اس موقعے پر پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ عرفان صدیقی کی شعری عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان پر ابھی تک کوئی تنقیدی یا تجزیاتی کام نہیں ہوا، اس کے باوجود بھی ادبی حلقے ان کی اہمیت کے معترف نظر آتے ہیں۔ سابق ایڈیٹر ''نیا دور'' شاہنواز قریشی نے کہا کہ ہم رچاؤ کا استعمال بھی شاعروں کے لیے بڑی آسانی سے کرتے رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رچاؤ اپنے صحیح مفہوم میں ہمیں عرفان صدیقی کی شاعری میں ہی ملتا ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں، وہ پہلے پوری طرح ان کے اندرون میں رچ بس جاتی ہے اس کے بعد معرض اظہار میں آتی ہے اور ایسا بہت کم فنکاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ محمد مسعود نے اس موقعے پر کہا کہ عرفان صدیقی کے یہاں تصوف کا پرتو بھی صاف نظر آتا ہے اور اس طور پر انسان دوستی اور انسان کی عظمت کی آئینہ داری بھی ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ مذاکرے میں ابوالحسنات، عائشہ صدیقی، اروند شکلا، مرزا شفیق حسین شفق اور شکیل صدیقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر معراج ساحل نے عرفان صدیقی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ مذاکرے میں فاطمہ وصیہ جائسی، عبدالسلام صدیقی، وضاحت حسین رضوی، شاہانہ سلمان، امان عباس، عرفان صدیقی کے بیٹے فیضی عرفان کے علاوہ بڑی تعداد میں ادب دوست موجود تھے۔ سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ظاہر قزلباش نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

(عالمی سہارا، نئی دہلی)

غضنفر کے ناولوں پر مذاکرہ

نئی دہلی، 13 رجون۔ اردو کے ممتاز ناول نگار غضنفر کے دو ناولوں ''دویہ بانی'' اور ''وش منتھن'' پر اردو پریس کلب کے زیر اہتمام ہمدرد یونیورسٹی، دہلی میں ایک ادبی مذاکرے کا انعقاد ہوا۔ اس موقعے پر غضنفر کے نئے ناول ''وش منتھن'' کی رسم اجرا بھی ادا کی گئی۔

جلسے کی صدارت آل انڈیا کرسچن کونسل کے سکریٹری جنرل جناب جون دیال نے کی اور سوامی اگنیس انند مہاراج مہمان خصوصی تھے۔

اس موقعے پر پیغام آفاقی نے کہا کہ اردو فکشن لکھنے والی ان کی نسل کو بامعنی اور سماجی طور پر باشعور ناول لکھنے کے لیے اب سے لگ بھگ بیس سال پہلے اردو ادب پر چھائے ہوئے جدید اور ترقی پسند ادب کے رویوں سے باقاعدہ بغاوت کا اعلان کرنا پڑا تھا اور اس کے نتیجے میں آج ایسے ناول سامنے آرہے ہیں جو موجودہ عہد کی سماجی کشمکش کے اہم ترین پہلوؤں کو موضوع بنا رہے ہیں اور ''وش منتھن'' اور ''دویہ بانی'' اسی کا نمونہ ہیں۔

جناب فرحت احساس نے کہا کہ غضنفر نے ''دویہ بانی'' دلت ادب کی نئی تعریف متعین کی ہے۔ مراٹھی کا دلت ادب غصے اور نفرت پر مبنی ہے جبکہ غضنفر نے اندر سے پیدا ہونے والی تبدیلی پر زور دیا ہے۔ اس ناول میں مابعد الطبیعاتی جبر اور Gheottoisation of soul کے خلاف انفرادی آزادی کی جنگ کو ایک نئی زبان اور حکمتِ عملی کے ساتھ ایک تخلیقی اظہار دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر انور پاشا نے کہا کہ ڈاکٹر غضنفر نے سات ناول لکھے ہیں اور یہ ساتوں ناول اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے مختلف اور متنوع سماجی حقیقتوں کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ساتوں ناول اردو ناول نگاری کے افق پر سات رنگوں والے قوس قزح کی طرح اپنے اپنے رنگ کو ابھارتے اور انھیں روشن کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انجم عثمانی نے کہا کہ موضوع، بیان اور مقصد کا ایسا تال میل موجودہ عہد میں کم تخلیق کاروں کے یہاں ملتا ہے۔ ''وش منتھن'' نئی نسل کے اس مثبت رویے کا عکاس ہے جو ملک کے مخصوص باشندوں کو باہری اور اندرونی جیسے لایعنی اصطلاحوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتا۔ جلسے میں سابق چیف الیکشن کمشنر جی کرشنا مورتی، ڈاکٹر مولا بخش اور خان شاہد وہاب نے بھی اظہار خیال کیا۔

غضنفر نے اپنے ناول ''دویہ بانی'' کا موضوع اور کہانی کا خلاصہ بہت ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا اور خاص طور پر انھوں نے دویہ بانی کے بول (شعری اقتباسات) کو اپنے مخصوص لب ولہجے میں پڑھ کر سنایا جس سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔

اردو پریس کلب کے سکریٹری طارق فیضی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور پیغام آفاقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

اس مباحثے میں نگار عظیم، کمل ناوری، عبدالرشید، سنیل سردار کے علاوہ ادب دوستوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

ہند و پاک سیمینار

● پنج کولہ، 4رمئی۔ ہریانہ اردو اکادمی کی جانب سے ''نئی نظم — ایک محاسبہ'' کے عنوان سے ایک ہند و پاک سیمینار کا انعقاد ہوا جس میں پروفیسر صادق نے نئی نظم میں ہیئت کے مختلف تجربات پر روشنی ڈالی۔ پاکستان سے آئے ''تخلیق'' کے ایڈیٹر اظہر جاوید نے پاکستان میں نئی نظم کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ابن کنول نے ترقی پسند نظم کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو نظم کے فروغ میں ترقی پسند شعرا نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر عزیز پریہار، ڈاکٹر زینت اللہ جاوید، ڈاکٹر فرزانہ نسیم اور ڈاکٹر محمد

ایوب خاں نے بھی اپنے مقالے پیش کیے۔ سمینار کی ابتدا میں اکادمی کے سکریٹری رمیندر جاکھو ساحل نے اکادمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ شمس تبریزی نے نظامت کے فرائض ادا کیے۔ (عالمی سہارا، نئی دہلی)

اردو آن لائن پروگرام

● نئی دہلی، 28/مئی۔ خط کتابت اردو کورس اور سینٹر فار انفارمیشن ٹیکنالوجی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے مشترکہ طور پر ہندی کے ذریعے اردو سکھانے کے لیے انٹرنیٹ پر "اردو آن لائن" تیار کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک خصوصی جلسہ کانفرنس ہال جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سید شاہد مہدی، وائس چانسلر کی صدارت میں منعقد کیا گیا۔ پروفیسر محمد میاں، اعزازی ڈائرکٹر، سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ اوپن لرننگ نے اپنے استقبالیہ کلمات میں اس پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر زاہد حسین خاں، رجسٹرار نے اپنے کلیدی خطبے میں اس پروگرام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ عہدِ حاضر میں اردو سے دلچسپی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور اس سلسلے میں یہ پروگرام بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ (ڈاک سے)

اردو کو ہندستان کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ

● الہ آباد۔ اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی جنرل سکریٹری ڈاکٹر پرواز علوم اعظمی نے کل ہند کانگریس پارٹی کی صدر سونیا گاندھی کو ایک مکتوب لکھ کر ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ اردو کو ہندستان کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور ملک میں ہندی اردو دونوں سرکاری زبانوں کی تعلیم بحیثیت ایک مضمون انٹرمیڈیٹ تک لازمی قرار دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ فی الحال جن ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جا چکا ہے یعنی اتر پردیش، بہار اور دہلی ان ریاستوں میں اردو ایک مضمون کے طور پر انٹرمیڈیٹ تک لازمی قرار دی جائے اور ہندی اردو دونوں میڈیم سے تعلیم دلائے جانے کا معقول انتظام کیا جائے نیز اس کے ساتھ سرکاری ملازمتوں میں اردو سے واقفیت کو لازمی بنایا جائے تاکہ دوسری سرکاری زبان اردو کے قانون کا مکمل نفاذ ہو سکے۔ (عالمی سہارا، نئی دہلی)

شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے ایم اے ماس میڈیا کے نصاب میں عصری ادب اور صحافت شامل

● میرٹھ۔ شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے ایم. اے. پروفیشنل اردو کورس کا نام تبدیل کرکے ایم اے ماس میڈیا (اردو) کر دیا گیا ہے۔

ایم اے ماس میڈیا (اردو) کے تحت اردو صحافت، عملی صحافت، ترجمہ نگاری، الیکٹرانک میڈیا، نیوز ریڈنگ، اینکرنگ، اسکرپٹ رائٹنگ، اشاعت، بازار، اشتہار (Publishing, Marketing, Advertising) ڈرامہ، (ریڈیو، ٹی وی، نکڑ ناٹک) وغیرہ کی تدریس کا عمل جاری ہے۔

گذشتہ دنوں ہونے والی نصاب کمیٹی کی میٹنگ میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر صادق اور ڈاکٹر شافع قدوائی نے شرکت کی۔ اردو صحافت کے پرچے میں اہم اردو روزناموں، ہفت روزہ اخبارات اور ماہناموں کو شاملِ نصاب کیا گیا۔ اس کورس میں ڈرامہ اور آئی. ٹی. کے علاوہ ادب کے بھی دو پرچے شامل ہیں۔ کورس میں داخلے کے لیے بی. اے./ بی. کام. اور بی. ایس. سی. مکمل کرنے والے طالب علم بھی اہل ہیں۔ شرط یہ ہے کہ انھیں اردو لکھنا اور پڑھنا آنا چاہیے۔ ایم. اے. اردو کا کورس بھی روایتی نصابات سے منفرد ہے۔ اس میں جہاں ایک پرچہ ماس میڈیا کا شامل ہے جس میں پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، کمپیوٹر گرافکس اور اسکرپٹ رائٹنگ وغیرہ شامل ہیں وہیں عوامی ادب کا پرچہ اور ڈزرٹیشن کو بھی شاملِ نصاب رکھا گیا ہے۔

شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے بتایا کہ شعبۂ اردو کے سبھی کورسز میں 50 فی صد کے تحریری امتحان ہوتے ہیں اور 50 فی صد نمبروں کے لیے طلبہ کو سمینار، اسائنمنٹ، انٹرنل امتحان، گروپ ڈسکشنس وغیرہ کرائے جاتے ہیں۔ (ڈاک سے)

اردو یونیورسٹی: ڈپلوما ان ایجوکیشن کورس میں داخلے کا اعلان

● حیدرآباد، 20/مئی: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے دو سالہ ریگولر کورس ڈپلوما ان ایجوکیشن میں داخلے کا اعلان کر دیا ہے جس کے انٹرنس ٹسٹ کے فارم حیدرآباد، دہلی، پٹنہ اور بنگلور میں دستیاب ہیں۔ نیشنل کونسل فار ٹیچر ایجوکیشن (NCTE) سے منظور شدہ اس کورس کی تکمیل پر عموماً طلبہ فوری طور پر پیشۂ تدریس سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ اردو ذریعۂ تعلیم کے اس کورس کا تعلق روایتی تعلیم سے ہے جس کی کلاسیز صرف حیدرآباد میں ہوں گی۔ تعلیمی سال 06-2004 میں 75 نشستوں پر داخلے کے لیے انٹرنس ٹسٹ کا انعقاد 25/جولائی 2004 (اتوار) کو صرف حیدرآباد میں ہوگا۔

ڈپلوما ان ایجوکیشن کے انٹرنس فارم مع پراسپکٹس یونیورسٹی ہیڈکوارٹر گچی باؤلی، حیدرآباد میں "مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی" کے نام حیدرآباد میں قابلِ ادا -/175 روپے کے ڈیمانڈ ڈرافٹ کے عوض شخصی طور پر دستیاب ہیں۔ یہ فارم بذریعہ ڈاک -/200 روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ حیدرآباد روانہ کرکے بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔ انٹرنس ٹسٹ میں شریک ہونے کے لیے درخواست داخل کرنے کی

آخری تاریخ 15 جولائی 2004 ہے۔ انٹرنس ٹسٹ میں وہ امیدوار شرکت کرسکتے ہیں جو 2+10 یا انٹرمیڈیٹ میں کم از کم 45 فیصد نمبرات سے کامیاب ہوئے ہوں اور جن کی عمر یکم جولائی کو 17 سال سے کم اور 28 سال سے زیادہ نہ ہو۔ جسمانی معذور، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب امیدواروں کے لیے 5 فیصد نمبرات اور حد عمر میں تین سال کی رعایت دی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ 5 نشستیں ایسے امیدواروں کے لیے محفوظ ہیں جو کسی سرکاری یا منظور شدہ اسکول میں کم از کم دو سال یا زائد سروس رکھتے ہوں۔ (ڈاک سے)

ہمدرد پبلک اسکول کا نتیجہ صد فیصد

● نئی دہلی، 28 مئی۔ سی. بی. ایس. ای کے دسویں جماعت کے امتحانات میں ہمدرد پبلک اسکول کے صد فیصد طلبہ کامیاب ہوئے ہیں۔ حکیم عبدالحمید کے قائم کردہ اور سید حامد کی سرپرستی میں سرگرم ہمدرد پبلک اسکول کے 70 طلبہ دسویں جماعت کے امتحانات میں شریک ہوئے تھے، جن میں سے 61 فرسٹ ڈویژن سے کامیاب ہوئے۔ ان میں سے 35 نے امتیازی نمبرات حاصل کیے ہیں۔ محمد احتشام نے 96 فیصد نمبر حاصل کیے اور اسکول میں پہلے مقام پر رہے۔ قمر ثاقب اور انعام اقبال نے بالترتیب 94 اور 93 فیصد نمبر حاصل کرکے دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی۔ (راشٹریہ سہارا نئی دہلی)

ساہتیہ اکادمی بھاشا سمان

● نئی دہلی، 30 اپریل۔ ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے اپنے اجلاس منعقدہ 29 اپریل کو زیرِ صدارت صدر ساہتیہ اکادمی پروفیسر گوپی چند نارنگ چار عالموں کو ان کے تحقیقی تنقیدی کام کے لیے بھاشا سمان اور 18 مترجمین کو تراجم ایوارڈ دینے کا اعلان کیا۔ بھاشا سمان پانے والوں میں سنسکرت کے دو دوان ڈاکٹر کیشو نند دیو گوسوامی اور فارسی کے عالم ڈاکٹر وارث کرمانی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرے دو ایوارڈ چھتیس گڑھی اور اُڑاؤں /کرک آدی باسی زبانوں کے ماہرین کو دیے گئے۔ یہ ایوارڈ 50 ہزار روپے نقد اور سند و توصیف نامے پر مشتمل ہیں۔

ساہتیہ اکادمی ہر سال مترجمین کو بھی ایوارڈ کے لیے منتخب کرتی ہے۔ یہ ایوارڈ 15 ہزار روپے نقد اور توصیف نامے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اردو میں اس سال یہ ایوارڈ وقار قادری کو ان کی ترجمہ شدہ کتاب دلت کتھا پر دیا گیا جو مراٹھی دلت افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بنگالی میں ملے رائے چودھری کو دھرم ویر بھارتی کی ہندی تخلیق "سورج کا ساتواں گھوڑا" کے ترجمے پر، انگریزی میں مرحوم سوجیت مکرجی کو رابندر ناتھ ٹیگور کے ناول "گورا" کے ترجمے پر، ہندی میں دیویش کو "ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات" کے ترجمے پر، مراٹھی میں اپرنا لانگر کو ارندھتی رائے کے "گاڈ آف اسمال تھنگس" کے ترجمے پر اور پنجابی میں اقبال دیپ کو اردو ناول 'گیان سنگھ شاطر' کے ترجمے پر دیا گیا۔

(قومی آواز نئی دہلی)

ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی کے اعزازات

● نئی دہلی، 30 اپریل۔ آل انڈیا ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی، دہلی کی جانب سے اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول، اجمیری گیٹ میں منعقدہ ایک تقریب میں مظہر الاسلام سیکنڈری اسکول کے وائس پرنسپل مشتاق بیگ کو ان کی بہترین انتظامی صلاحیتوں کے اعتراف میں "بیسٹ پرنسپل" ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایس کے وی، بلبلی خانہ کی پرنسپل مسز رافعہ ظفر علی اور مارواڑی سینئر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل ایس سی گپتا کو بھی ان کی انتظامی صلاحیتوں کے اعتراف میں ایوارڈ پیش کیے گئے۔ یہ ایوارڈ مہمانِ خصوصی رمیش دتہ، ڈپٹی میئر، دہلی کے ہاتھوں سے عطا کیے گئے۔ اس موقعے پر سوسائٹی نے اینگلو عربک سینئر سیکنڈری اسکول کے عارف عثمانی، گورنمنٹ بوائز سینئر سیکنڈری اسکول، پٹودی ہاؤس کے فرید احمد اور مظہر الاسلام سیکنڈری اسکول کے صغیر اختر کے علاوہ تین دیگر اساتذہ کو بھی ایک ایک مومنٹو اور سند پیش کی۔ ڈسٹرکٹ سنٹرل کی ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن مسز ریتا شرما کو تعلیمی فروغ کے لیے ایک یادگار پیش کی گئی۔ دیگر انعام پانے والوں میں ریتا شرما، ایس سی گپتا، مبینہ عاقل، یاسمین رئیس، طاہر الحسن، محمد وسیم احمد، شاداب فدائی دہلوی، تمیز الدین تمیز دہلوی، عتیق صدیقی، زین العابدین، نہال احمد خان شامل ہیں۔ اس موقعے پر سوسائٹی کے سرپرست اعلا حاجی ابراہیم بیگ اور جنرل سکریٹری اقبال احمد کے ساتھ سوسائٹی کے دیگر اراکین بھی موجود تھے۔ سوسائٹی نے دہلی کے 22 اسکولوں کا انتخاب کرکے ہر اسکول کے تین ٹاپرز کو انعامات و سرٹیفکیٹ دیے۔ فنکشن میں مختلف اسکولوں کے پرنسپلز، اساتذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔ (راشٹریہ سہارا نئی دہلی)

شاہ ولی اللہ ایوارڈ برائے 2003

● انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، نئی دہلی کی جانب سے اسلامی اقدار کے فروغ میں شاہ ولی اللہؒ کی خدمات کے اعتراف میں سماجیات، ادبیات، قانون اور اسلامیات کے میدانوں میں نمایاں کارنامے انجام دینے والے ممتاز دانشوروں کے اعزاز میں شاہ ولی اللہ ایوارڈ کی ابتدا 1999 سے کی گئی۔ یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے نقد اور ایک توقیر نامے پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ اب تک مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، پروفیسر محمد نجات اللہ صدیقی اور مولانا شہاب الدین ندوی کو دیا جاچکا ہے۔

پانچویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ۔ 2003 کا عنوان "تاریخ نویسی۔ اسلامی

تناظر میں'' طے کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ اس اسکالر کو دیا جائے گا جس نے اسلامی تاریخ نویسی کے میدان میں انتہائی اہم کام کیا ہے اور مستقل طور سے اسلامی فریم ورک میں تاریخ نویسی کو ترقی دی ہے۔ 2003 کو ایوارڈ کے لیے موزوں و مستحق دانشور کے نام کی تجویز کے لیے ادارہ ملتمس ہے۔ مجوزہ نام موصول ہونے کی آخری تاریخ 31 راگست 2004 ہے۔ تجویز کردہ دانشور کی کاوشات بمع حتی الممکنہ تفصیلات معینہ فارم پر ہونا چاہیے۔ مزید برآں اسلامی فکر رکھنے والے 45 سال سے کم عمر کے صاحب علم وقلم حضرات کی حوصلہ افزائی کے لیے ہر سال معینہ عنوان پر سب سے عمدہ مقالہ لکھنے والے اسکالر کو 25000 روپیے کا نقد انعام مختص کیا گیا ہے۔ 2003 کے لیے مقالے کا عنوان ''انسانی حقوق — اسلامی تناظر میں'' طے کیا گیا ہے۔ مقالہ وصول ہونے کی آخری تاریخ 15 رستمبر 2004 ہے۔ معینہ فارم و دیگر تفصیلات کے لیے پروگرام آفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، پوسٹ بکس نمبر :126,9725، جوگا بائی، مین روڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی-25 سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ (ڈاک سے)

تقسیم اسناد کے جلسے

● حیدرآباد، 26 راپریل۔ قومی اردو کونسل کی طرف سے آل انڈیا اردو ایجوکیشن کمیٹی کے زیرِ اہتمام چلائے جارہے کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر فور ویمن کا جلسۂ تقسیم اسناد کالج ڈیولپمنٹ کمیٹی آفس میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت شری موہن کانڈا، چیف سکریٹری، حکومتِ آندھراپردیش کی اہلیہ محترمہ اوشا کانڈا نے کی۔ انھوں نے طالبات کو خطاب کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول پر زور دیں تاکہ انھیں مستقبل میں اچھی نوکریاں حاصل ہوسکیں۔ جناب ایم.اے. قدوس ایڈیشنل سکریٹری، اعلا تعلیم، حکومتِ آندھرا پردیش نے طالبات کو پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ پہلے صرف چند لڑکیاں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرتی تھیں لیکن آج ان کی تعداد 40 فیصد ہے۔ انھوں نے آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی کے چیئرمین جناب محمد جلیل پاشا کی ان کوششوں کی ستائش کی جو انھوں نے اردو داں طلبہ کو پیشہ ورانہ تعلیم سے جوڑنے کے لیے کی ہیں۔

اس موقعے پر جناب محمد جلیل پاشا نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا کہ تمام تعلیمی اداروں میں کمپیوٹر تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ انھوں نے پورے ملک میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ بھی کیا۔ مجاہد آزادی شری پریم راج یادو کے اظہار تشکر پر جلسے کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد، 19 رفروری۔ صدانی کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر عثمان باغ بہادر پورہ کے جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے جناب عبدالقیوم خاں ایڈیشنل کمشنر پولیس نے کہا کہ مشکل سے مشکل کام کو انسان کا عزم اور اس کا بلند حوصلہ آسان بنا دیتا ہے۔ تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر ہم میں سے ہر فرد اپنی ذمے داری کو محسوس کرتے ہوئے تعلیمی میدان میں دلچسپی لے گا تو قوم خود بخود ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گی۔ طلبہ کو سخت محنت کرنی چاہیے۔ کوشش اور لگن سے حاصل کی ہوئی علم کی دولت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ مواقع موجود ہیں، لیکن اہلیت کا فقدان محرومی کا سبب بنا ہوا ہے۔ تقریر سے قبل جناب اے کے خاں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ڈپارٹمنٹ آف الیکٹرانکس DOEACC وزارت انفارمیشن ٹیکنالوجی، حکومتِ ہند کی جانب سے دیے گئے مشترکہ سرٹیفکیٹس ڈی.ٹی.پی. طلبہ و طالبات کے درمیان تقسیم کیے۔ ابتدا میں مولانا خلیل احمد ندوی نظامی صدر نشین صدانی ایجوکیشنل سوسائٹی نے کہا کہ صدانی ایجوکیشنل سوسائٹی شروع سے ہی تعلیم کو عام کرنے کی مہم میں مصروف ہے۔ جناب امین احمد الیاس انجینئر محکمہ آبپاشی، حکومتِ آندھراپردیش مولانا محمد انوار اللہ خاں نائب صدر سینئر اور قاضی محمد انیس الدین فاروقی صدر مریم ایجوکیشنل سوسائٹی نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ محمد عثمان نے جلسے کی نظامت کی۔ توفیق احمد فیکلٹی اور معین محی الدین کے شکریے پر جلسہ اختتام کو پہنچا۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

کم ہوتا ہوا آسماں

● نوئیڈا۔ گذشتہ دنوں ''نورنگ کتاب گھر'' کے زیر اہتمام رفعت سروش کے نئے مجموعۂ کلام ''کم ہوتا ہوا آسماں'' کا اجرا مظہر امام کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس جلسے کی نظامت بزرگ ادیب بلراج ورما نے کی۔ مظہر امام نے اپنی تقریر میں کہا کہ رفعت سروش نے نصف صدی سے زیادہ کا اپنا یہ شعری سفر بڑی ثابت قدمی سے طے کیا ہے، خواہ وہ ترقی پسند تحریک ہو یا اس کے بعد کا ادبی منظرنامہ، رفعت سروش نے اپنی الگ پہچان بنائے رکھی۔ وہ خاص طور پر آزاد نظم کے فارم میں ہمیشہ کامیاب تجربے کرتے رہے ہیں۔ بلراج ورما نے رفعت سروش کو اوپیرا کا سب سے اعلا شاعر قرار دیا۔ اس موقعے پر ایک محفل شعروسخن بھی آراستہ ہوئی جس میں راج کماری راز، کلدیپ گوہر، رند سری واستو، وقار صدیقی، تابش مہدی، مظہر امام، گلزار دہلوی، ڈاکٹر شبانہ نذیر نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

انہار

● سرینگر، 7 راپریل۔ ریڈیو کشمیر کے آڈیٹوریم میں منعقدہ ایک تقریب میں معروف اردو شاعر جناب رفیق راز کے اولین شعری مجموعے ''انہار'' کی رسم رونمائی انجام پائی۔ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جلیس احمد خاں ترین

نے رسم اجرا انجام دی جبکہ تقریب کی صدارت کشمیری زبان کے قد آور شاعر اور ادیب پروفیسر رحمٰن راہی نے کی۔ نظامت کے فرائض جناب دانش اقبال نے انجام دیے۔

تقریب میں شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی کے صدر پروفیسر قدوس جاوید نے رفیق راز کی شاعرانہ خوبیوں اور انفرادی رنگ پر ایک مقالہ پیش کیا جبکہ دیگر مقررین نے رفیق راز کے کلام کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی۔ تقریب میں اردو اور کشمیری زبان کی متعدد شخصیات موجود تھیں۔ (ڈاک سے)

سرگوشیاں زمانوں کی

● ممبئی، یکم مئی۔ عبدالاحد ساز کے دوسرے شعری مجموعے "سرگوشیاں زمانوں کی" کی تقریب رونمائی انجمن ترقی اردو ہند (مہاراشٹر) اور انجمن اسلام ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا جونیر کالج کے زیر اہتمام منعقد کی گئی جس کی صدارت ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا نے کی۔ ممتاز شاعر اور دانشور جناب جاوید اختر نے کتاب کا اجرا کرتے ہوئے عبدالاحد ساز کی شاعری میں موجود روایت اور جدت کے مابین تخلیقی تناؤ کو دلچسپ مثالوں سے واضح کیا۔

کالج کی پرنسپل محترمہ سلمیٰ لوکھنڈوالا کی استقبالیہ تقریر اور مقالے کے بعد مشہور مزاح نگار فیاض احمد فیضی نے ساز کی شخصیت پر ایک دلچسپ خاکہ پیش کیا۔ ساز کے ہم عصر شاعر جاوید ناصر، مشہور افسانہ نگار انور قمر اور ڈاکٹر عرفان فقیہ نے اپنے مضامین میں ساز کی شاعری کے فکری وفنی پہلوؤں سے بحث کی جبکہ معروف صحافی شمیم طارق اور ممبئی یونیورسٹی کی سابق صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی نے اس شعری مجموعے پر تنقیدی نظر ڈالی۔ اس موقعے پر مہمانانِ خصوصی ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم، اعظم کیمپس پونہ کے چیئرمین منور پیر بھائی اور شہر کی نامور سماجی شخصیات جناب علی ایم شمسی اور جناب سیح خطیب (سرپرست انجمن ترقی اردو) نے بھی اپنے تاثرات ظاہر کیے۔

اس تقریب میں حسن کمال، ظفر گورکھپوری، پروفیسر شاکر گایا، ڈاکٹر آدم شیخ، نہرو سینٹر ممبئی کے ڈائرکٹر لطافت قاضی، ساجد رشید، ڈاکٹر عبدالرؤف، ڈاکٹر شفیع شیخ اور آدم ملا بطور مہمانانِ اعزازی موجود تھے۔ اس نشست میں عبدالاحد ساز نے اپنی تقریر میں اپنا شعری موقف واضح کیا اور سامعین کی فرمائش پر اپنی نظمیں سنائیں۔ اس جلسے کی نظامت نئی نسل کے شاعر حامد اقبال صدیقی نے کی۔

(ڈاک سے)

ڈاکٹر آدم شیخ — حیات، شخصیت اور فن

● ممبئی۔ ڈاکٹر شیخ عبداللہ کی کتاب "ڈاکٹر آدم شیخ — حیات، شخصیت اور فن" کی تقریب رونمائی 17 اپریل کو انجمن اسلام الانا ہائی اسکول کرلا ممبئی میں ہوئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر اشفاق انجم، جناب یوسف ناظم، جناب شمیم طارق، ڈاکٹر شفیع شیخ اور ڈاکٹر مصطفےٰ پنجابی نے ڈاکٹر آدم شیخ کی شخصیت اور فکر وفن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کی صدارت انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر محمد اسحٰق جمخانہ والا نے کی۔ اس ادبی تقریب کا اہتمام قیصر الجعفری فاؤنڈیشن نے کیا تھا۔ (ڈاک سے)

قرآن اور سائنس سمینار مقالات

● علی گڑھ، 19 مارچ۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام "قرآن وسائنس" کے موضوع پر سہ روزہ سمینار 10-8 جنوری 2003 کو منعقد ہوا تھا۔ اس کے اردو مقالات کا مجموعہ "قرآن اور سائنس — سمینار مقالات" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مرتب پروفیسر عبدالعلی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ہیں۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں 19 مارچ کو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سمینار کے افتتاحی اجلاس میں وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جناب نسیم احمد کے ہاتھوں اس کا اجرا عمل میں آیا۔ قرآن وسائنس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق 15 مقالات کا یہ مجموعہ تین سو بیس صفحات پر مشتمل ہے۔ ان مقالات کے اہم موضوعات یہ ہیں: قرآن اور سائنس پر مطالعہ وتحقیق کا مناسب طریقہ، عقلی وسائنسی نقطۂ نظر کے فروغ میں قرآن کا حصہ، بعض مشہور تفاسیر کے سائنسی مباحث، علم آدم، قرآن وعلم اجنین، قرآن وتخلیق ازواج، کائنات کی تخلیق میں قرآن کی بیان کردہ مدت کی تشریح، قرآن اور پانی، قرآن اور حفظانِ صحت، قرآن اور ماحولیات کا تحفظ۔

کتاب کے آخر میں قرآن اور سائنس پر منتخب کتابیات (مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی) بھی شامل ہے جس میں اس موضوع پر علی گڑھ میں دستیاب اردو وانگریزی کتابوں کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کتاب پبلیکیشنز ڈویژن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

(ڈاک سے)

مختصرات

● گورکھپور، 23 مارچ۔ "اردو زبان اور جدوجہد آزادی دونوں مشترکہ تہذیب اور باہمی اتحاد کی ضامن ہیں۔" پروفیسر فضل امام نے ڈاکٹر درخشاں تاجور کی کتاب "جنگِ آزادی شخصیات نظریات وتحریکات" کا اجرا کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کتاب میں ایسے بہت سے حقائق ہیں جن پر ہماری نگاہ نہیں پہنچی تھی اور اس کی ضرورت ہے کہ ایسی کتابیں ہندی زبان میں بھی شائع ہوں۔ اس موقعے پر پروفیسر پرمانند سریواستو، پروفیسر رضوی، ڈاکٹر عزیز احمد، ڈاکٹر افغان اللہ خاں، ایم کوٹھیاوی راہی اور صدر جلسہ ڈاکٹر احمر لاری نے بھی خطاب کیا۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد، 20/اپریل۔ جناب شاغل ادیب کے ڈراموں اور فیچرس کے مجموعے "لکیریں" کی رسم اجرا اردو ہال، حمایت نگر میں زیر صدارت پروفیسر یوسف سرمست سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی انعقاد پذیر ہوئی۔ "لکیریں" کی رسم اجرا جناب صلاح الدین نیر مدیر" خوشبو کا سفر" کے دستِ مبارک سے انجام پائی۔ جناب شفیع اقبال مدیر" ہماری منزل" ناظمِ جلسہ تھے۔ اس موقعے پر مقررین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ شاغل ادیب ایک اچھے شاعرو ادیب، محقق اور نقاد ہی نہیں بلکہ ایک اچھے ڈرامہ و فیچر نگار بھی ہیں۔ شاغل ادیب کی ادبی خدمات حیدرآباد اور سکندرآباد دونوں شہروں کو محیط ہیں۔ ان کا رجحان کلاسکیت کے علاوہ جدید اصناف کی جانب بھی شدت سے رہا ہے۔

(ڈاک سے)

● کامٹی۔ گذشتہ دنوں قدوسی ہاؤس نزد تاج چوک، نیا بازار، کامٹی میں منعقدہ ایک تقریب میں ڈاکٹر محمد یاسین قدوسی ناظم کتبات محکمۂ آثار قدیمہ ناگپور کی تصنیف "مشاہیرِ ناگپور اور کامٹی" کا اجرا ڈاکٹر مدحت الاختر اور ڈاکٹر ارشد جمال کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اپنی تقریر میں صدر تقریب ڈاکٹر ارشد جمال اور ڈاکٹر مدحت الاختر نے اس علاقے کی مختلف سرگرمیوں اور شخصیات کو کتابی شکل میں محفوظ کرنے پر ڈاکٹر یاسین قدوسی کو مبارک باد پیش کی۔ تقریب اجرا میں شعروادب اور تعلیم و تحقیق سے منسلک افراد کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر الیاس قدوسی (ڈائرکٹر اوپی گرافی) جناب حفظ الرحمٰن، جناب ریاض الخالق اور ڈاکٹر ایم یونس افسر کامٹوی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض جناب حفظ الرحمٰن نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

● رفیع گنج (اورنگ آباد، بہار)۔ 28/مارچ کو رفیع گنج کے کسان بھون میں ڈاکٹر محمد سلیم واحد کے شعری مجموعے" وقت کے سپنا" کی رسمِ اجرا بدست ڈاکٹر علیم اللہ حالی سابق صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی عمل میں آئی۔ یہ کتاب اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں ہے۔ جلسے کی صدارت ماہرِ چشم ڈاکٹر ظفر السلام نے اور نظامت تمنا مظفر پوری نے کی۔ اس تقریب میں بہت سی معزز ہستیاں اور دانشور حضرات نے شرکت کی اور ڈاکٹر سلیم واحد کی شاعری کے ساتھ ان کی سماجی خدمات پر روشنی ڈالی۔ (ڈاک سے)

● دربھنگہ، 3/اپریل۔ متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر راج منی پرساد سنگھ نے ڈاکٹر مشتاق احمد استاد شعبۂ اردو ملت کالج، دربھنگہ کو للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ، بہار کے مولانا ابوالکلام آزاد چیئر کا ڈائرکٹر مقرر کیا ہے۔ اس چیئر کا قیام 1996 میں ہوا تھا لیکن اب تک اس پر کسی کا تقرر نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر مشتاق احمد اردو کے نئی نسل کے شاعر اور ادیب کے ساتھ ساتھ صحافی بھی ہیں۔ ان کی ادارت میں ایک جریدہ" جہانِ اردو" دربھنگہ سے شائع ہوتا ہے۔ ان کی ادارت میں برسوں تک ہفتہ وار" آوازِ نو" بھی شائع ہو چکا ہے۔ (ڈاک سے)

● آگرہ، 29/مارچ۔ ایوانِ میر، آگرہ کے زیرِ اہتمام میر تقی میر کی یاد میں ایک آل انڈیا مشاعرہ، سمینار اور تقسیم ایوارڈ کا انعقاد لال بلڈنگ گھیر کالے خاں، نائی کی منڈی، آگرہ میں کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح ایوانِ میر کے سرپرست جناب اقبال احمد نے کیا اور صدارت جناب ہوش نعمانی نے کی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر آئی اے خاں تھے۔ پروگرام کا پہلا حصہ تقسیم ایوارڈ پر مشتمل تھا جس کی نظامت ایوانِ میر آگرہ کے صدر ڈاکٹر ارشاد احمد نے کی۔ ابتدا میں جناب انور شمیم نے میر تقی میر پر مقالہ پیش کیا۔ میر تقی میر ایوارڈ جناب آئی اے. خان نے اور امتیازِ میر ایوارڈ کی سند جناب شاہد ندیم نے مکیش اجمیری کی خدمت میں پیش کی۔ مشاعرے میں مکیش اجمیری، ہوش نعمانی، اقبال اشہر، مہندر سنگھ رشک، نظر ایٹوی، اقبال خلش، وصی احمد وصی، نوشہ امجدی، ہاشم نعمانی، امیر احمد، زیدی بانڈوی، صالحین نجمی، انور شمیم، اصغر اکبرآبادی، ہاشم فیروزآبادی، محمود اکبرآبادی، عزم شاکری، حسن اقبال، وقار مخموری، حامد بھوپالی، راحت کرہانوی اور جناب انجم نے اپنا کلام پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● چھتیس گڑھ کی ادبی انجمنوں بزمِ شعروسخن، بزمِ خدمتِ خلق، بزمِ دوستاں اور انجمن ترقی اردو، ہند کی جانب سے ممتاز ادبی شخصیت رونق جمال کی پچاسویں یومِ پیدائش پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت کماری سروج پانڈے نے کی۔ بعدازاں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں ندیم کانپوری، نواب ظفر جمشید پوری، منظور جبلپوری سلام کوثر، گوہر جمالی، قاسم رائے پوری، سخنور حسین سخنور، حسن ظفر، سلیمان ایرانی، ڈاکٹر نوشاد، ڈاکٹر ظفر صدیقی، نظام بدرالدین بدر نے شرکت فرمائی۔ نظامت کے فرائض حسین سخنور نے انجام دیے۔

(ڈاک سے)

● میرٹھ سردھنہ کی معروف ادبی، سماجی اور فلاحی تنظیم" افکار" نے سردھنہ کے مشہور شاعر" ضمیر نوحی" کے یومِ وفات پر" ضمیر نوحی ایوارڈ" شروع کیا ہے۔ پہلے" ضمیر نوحی ایوارڈ" کے لیے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کو منتخب کیا گیا ہے۔ (ڈاک سے)

● میرٹھ، 8/جون۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو رواں تعلیمی سال 05-2004 سے دو نئے کورس شروع کرنے جارہا ہے شعبے میں اس سال ایم فل. اردو اور ڈپلوما ان اردو کا کورس شروع کر رہا ہے ایک سال (دو سمسٹر) کا یہ کورس خاص طور پر ان افراد کے لیے ہے جو اردو نہیں جانتے۔ اس میں داخلے کی اہلیت انٹرمیڈیٹ ہے اس جزوقتی کورس کی کلاسز ہفتے میں تین دن شام میں ہوں گی۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

● بارہ بنکی، 7 رجون۔ ڈاکٹر ساغر اعظمی سرزمین بارہ بنکی کی خاک کا پیوند بن گئے۔ ان کا 6 رجون کو سہ پہر بلیا ضلع صدر اسپتال میں شدید قلبی دورہ پڑنے کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ تقریباً 40 برس تک نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کے مختلف ممالک اور مقامات پر ہونے والے مشاعروں میں اپنی آواز کا جادو جگانے والے ساغر اعظمی کا اصل نام امتیاز احمد تھا، ان کا آبائی وطن شیخو پور ضلع اعظم گڑھ تھا۔ ڈاکٹر ساغر اعظمی کی تدفین کے موقعے پر ان کے پرستاروں اور احباب کے علاوہ متعدد مقتدر شخصیات موجود تھیں۔

مرحوم ساغر اعظمی کے مجموعۂ کلام 'کاغذ کا شہر'، 'پیاسی غزلیں اور کھلے دریچے' منظر عام پر آچکے ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی، تاج مہوتسو، چکردھر مہوتسو، کسان سیما بھارت رتن اور جدہ میں کنسالیٹیڈ جنرل آف انڈیا ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا تھا۔ وہ اتر پردیش اردو اکادمی کی ایگزیکیٹو کمیٹی کے ممبر اور ضلع امن کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے ہندستان کے مختلف مقامات پر ہونے والے مشاعروں کے علاوہ پاکستان، دبئی، سعودی عرب، مسقط، نیردبی، شارجہ اور امریکہ کے مشاعروں میں شرکت کی۔ ڈاکٹر ساغر اعظمی ایک مقبول شاعر کے علاوہ بہترین انسان بھی تھے جس کی وجہ سے وہ عوام کے ہر طبقے میں بے انتہا مقبول تھے۔

❑❑❑

دھوپ چولھا

مصنف : ایم. ایم. ہنی / مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔
دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے
کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں
ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا باعث بنتے رہے ہیں۔
"کیمیا کی کہانی" میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم
اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

سائنس کی کہانیاں (حصہ اول)

مصنف: سکلف اور سکلف / مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا
تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ زیر نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے
مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق
تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت: 18 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہ راست
اس ملک اور معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، خورد و نوش، عادات و اطوار اور عقائد وغیرہ سے
واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع اور فنی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔
اس لیے یہ عوام سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں
جو عوامی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت: -/23 روپے

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مہجور / انتخاب: شمیم احمد

محمد بخش مہجور کی کتاب "نورتن" قدیم ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ نو ابواب پر مشتمل
اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ زیر نظر انتخاب میں
بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان سہل اور عام فہم بنا دی گئی ہے
تاکہ بچے انھیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہو سکیں۔

صفحات: 192، قیمت: -/20 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریح طبع کا ذریعہ رہی ہیں
ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی
پیش کش سے قطع نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔
اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت -/18 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تبصرہ وتعارف

ہندستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری / گوپی چند نارنگ

صفحات:-600، قیمت:-/300 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ویسٹ بلاک-1
آر کے. پورم، نئی دہلی-66
مبصر: محمود سعیدی

اردو ہندستان کی اہم قومی زبانوں میں ہے۔ متحدہ ہندستان میں غیر ملکی تسلط کے خلاف جو لڑائی لڑی گئی، اس کے ہر مرحلے میں اردو کا کردار رہنمایانہ رہا، بالخصوص اردو شاعروں نے جذبۂ حریت کو پروان چڑھانے اور قومی جذبات کو بیدار کرنے میں بہت ہی بے خوفی سے حصہ لیا۔ یہ کتاب جو اردو کے ممتاز و معتبر ناقد اور محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ کے وسیع مطالعے اور اس موضوع سے ان کی خصوصی دلچسپی کا ثمرہ ہے، اس اجمال کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کرتی ہے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں ان تخلیقات کا تذکرہ وتعارف شامل ہے جو ہندستان کے فطری آثار و مناظر کو پیش کرتی ہیں اور جن میں یہاں کے موسم، تہوار، پہاڑ، ندیاں، چرند و پرند، پھل پھول، نباتات، باغات، شہر اور زیارت گاہیں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔ دوسرے باب میں مشترک ہندستانی معاشرت کے مختلف مظاہر کی متحرک لفظی تصویریں ملتی ہیں۔ ان مظاہر میں میلے ٹھیلے، تفریحی مشاغل، رسم و رواج، شادی بیاہ کے لوازمات، ملبوسات، عام بود وباش، آداب و اطوار اور گلی محلوں کے مرقعے دامنِ دل کھینچتے نظر آتے ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ — وطنیت، سامراج دشمنی اور جدوجہد آزادی کی جو ترجمانی اردو شاعری میں ہوئی ہے، اس کا احاطہ کرتا ہے۔ اس حصے کے پہلے لیکن کتاب کے تیسرے باب میں اردو شاعری میں حب وطن کی روایت پر محققانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور امیر خسرو کے علاوہ اہم دکنی، دہلوی اور لکھنوی شعرا کے کلام میں جس تواتر سے اس روایت کی توسیع ہوئی ہے، اس کے نمونے دیے گئے ہیں۔ چوتھے باب کا عنوان ''1857 اور اردو شاعری'' ہے۔ یہ باب ان تمام منظومات کا احاطہ کرتا ہے جو 1857 کے واقعات پر اردو شعرا نے سیاہی سے نہیں اپنے خونِ دل سے رقم کی ہیں اور ان میں وہ درد پوری طرح سمو دیا ہے جو پورے ملک کا درد مشترک تھا۔ باب پنجم میں ''غدر'' کے بعد کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور ان حالات نے ملک کے حساس ذہنوں پر جو نقوش مرتسم کیے ان کی ترجمانی اردو شاعری میں کس خوبی سے ہوئی ہے، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب میں حالی، شبلی، آزاد اور ان کے ہمنواؤں کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں پہلی جنگ عظیم کے زمانے کی شاعری زیرِ بحث آئی ہے جو حالی، شبلی اور آزاد کے بعد کی شاعری ہے۔ اس میں اکبر الٰہ آبادی کے علاوہ اقبال، چکبست، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور جوش ملیح آبادی کے ساتھ ساتھ افسر میرٹھی، تلوک چند محروم، حفیظ جالندھری، آنند نرائن ملا، شاد عظیم آبادی، صفی، سیماب اور کئی دیگر شعرا کے حوالے ہیں جنھوں نے اپنی تخلیقات میں قومیت اور وطنیت کے جذبے کو ابھارا اور اسے تقویت دی۔ اس حصے میں بسمل عظیم آبادی کی اس مشہور غزل کا حوالہ بھی ہے جس میں غزل کی مخصوص لفظیات میں آزادیِ وطن کی خاطر اہلِ وطن کے جذبۂ جہاد کی عکاسی کی گئی ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوِ قاتل میں ہے

ساتویں باب میں جو اس حصے کا آخری باب بھی ہے، ترقی پسند اور قوم پرست شعرا اور ان کی تخلیقات موضوعِ گفتگو ہیں۔ اس باب میں شامل شعرا کی فہرست بہت طویل ہے اور یہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کے ان تمام میلانات و رجحانات کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جو تاریخی، سیاسی اور سماجی معنویت کے حامل تھے۔ اس دور کے میلانات و رجحانات کی بھرپور عکاسی کے لیے صفِ اوّل کے شعرا کے علاوہ دوسری صف کے شعرا کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ جگر اور فراق غزل کے بڑے شاعر ہیں اور ان کی داخلی کائنات ہی ان کی شعری کائنات ہے لیکن خارجی صورتِ حال سے انھوں نے بھی صرفِ نظر نہیں کیا اس لیے ان کا حوالہ بھی آیا ہے۔

اس ضخیم کتاب کا، جو اپنے موضوع کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے، تیسرا حصہ مطالعاتِ خصوصی پر مشتمل ہے۔ اس میں چھ مضامین ہیں جن کے عنوانات سے ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عنوانات اس طرح ہیں: (1) غالب کا جذبۂ حب الوطنی اور سنہ ستاون، (2) درگا سہائے سرور اور عروسِ حبِ وطن، (3) محمد علی جوہر کی شاعری اور جذبۂ حریت، (4) شعرِ حسرت کی سیاسی جہت پر ایک نظر، (5) محروم کی قومی شاعری، (6) جوش ملیح آبادی: شاعرِ حریت و انقلاب۔ عنوانات سے ان مضامین کی نوعیت کا تو کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن جس تنقیدی بصیرت کے یہ حامل ہیں، اس سے بہرہ یابی کے لیے ان کا تمام و کمال مطالعہ ضروری ہے۔

جاں نثار اختر مرحوم نے بہت پہلے غالباً ہندستانی ادبی ٹرسٹ کے لیے ایک

کتاب "ہندوستاں ہمارا" کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کی تھی۔ اس کتاب کی افادیت یہ تھی کہ اس میں وطنی اور قومی موضوعات پر قدیم و جدید شعرا کی اہم نظمیں یکجا کر دی گئی تھیں لیکن زیرِ تبصرہ کتاب نظموں کا مجموعہ نہیں ہے، یہ ان مباحث پر مشتمل ہے جو فاضل مصنف کے برسوں کے غور و فکر کا حاصل ہیں اور جن میں اردو کی وطنی اور قومی شاعری اپنے پورے تاریخی اور سماجی سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ کتاب کے تینوں حصے اور ان حصوں کے ذیلی ابواب ایک مربوط اور منظم فکر کی نمائندگی کرتے ہیں، ایک ایسی مربوط اور منظم فکر جو کھلے اور غیر مشروط ذہن کی پروردہ ہے۔ آخر میں کتابیات کی فہرست اور اشاریہ بھی شامل ہے۔

•

ہندوستان کا شاندار ماضی/اے. ایل. باشم

مترجم: ایس. غلام سمنانی

صفحات:-748، قیمت:-/145 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: محمد سمیع الدین ندوی

کہا جاتا ہے کہ "تاریخ آئینۂ گذشتہ است و درس حال" اور یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ یہ ہمیں اولادِ آدم کی ان کاوشوں اور جد و جہد کے ان پہلوؤں سے واقف کراتی ہے جن سے گزر کر انسان عہدِ بربریت سے دورِ تمدن تک پہنچا۔ یہ درحقیقت انسانی زندگی اور اس کے اہم کارناموں کا ایک ریکارڈ ہے، اس کے علمی، ادبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تمدنی سرمایے کا ماخذ ہے۔ تاریخ ماضی کی تصویر حال کے آئینے میں پیش کرتی ہے، اس کا مطالعہ جہاں ایک جانب ہمیں ماضی کے خد و خال سے روشناس کراتا ہے وہیں دوسری جانب حال کو سمجھنے اور مستقبل کو سنوارنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "ہندوستان کا شاندار ماضی" ماضی کے واقعات و حادثات سے روشناس کراتے ہوئے ہمارے اسلاف کے ان کارناموں کو ہمارے سامنے لاتی ہے جو ہمارے لیے باعثِ فخر بھی ہیں اور جن سے ہم عبرت و بصیرت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں اے. ایل. باشم نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو ایک انوکھے انداز میں پیش کیا ہے اور اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ کوئی پہلو خواہ وہ تہذیب و ثقافت سے متعلق ہو یا حکومت و سیاست سے، تشنہ نہ رہے۔ اسی طرح عقائد اور مذاہب، مابعد الطبیعات، اور زبان و ادب کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور رسم خط کے موضوع پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں ہندوستان اور اس کے قدیم تمدن کا تعارف پیش کیا گیا ہے اسے قدیم ہندوستان کی بازیافت کی کوشش کہا جا سکتا ہے جس میں قدیم ہندوستان کی عظمت کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ہڑپا اور آریائی تمدن کا ذکر ہے ہڑپا شہری تمدن، وادی سندھ کے شہروں کا زوال، ہند یورپی اور آریہ، آریہ ہندوستان میں، اور رگ وید تمدن جیسے ذیلی عنوانات کے تحت ہڑپا اور آریائی تمدن کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ باب سوم میں قدیم اور عہد وسطیٰ کی سلطنتوں اور باب چہارم میں اس دور کی سیاست، زندگی و افکار، باب پنجم میں معاشرہ، طبقہ، خاندان اور فرد کے عنوانات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ باب ششم میں عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی روزمرہ کی زندگی اور شہر و دیہات کے معمولات کو ذیلی عنوانات دیہات، زراعت، مویشیوں کی پرداخت، وحشی قبائل، کارواں اور تجارتی راستے کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ باب ہفتم میں مذہب و عقائد کا ذکر ہے اولاً رگ وید کے دیوتاؤں، آریائی عقائد کے مطابق قربانی، ریاضت، اپنشدوں کی اخلاقیات کا ذکر ہے۔ پھر بدھ مذہب، اس کے فروغ اور بدھ اخلاقیات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد جین مذہب کا بیان ہے۔ چوتھے نمبر پر ہندو مذہب کا تفصیلی تعارف ہے جس میں وشنو، شیو، وشنو اور شیو کے روابط، ادنیٰ درجے کے دیوی دیوتا، نیم دیوتا اور ارواح، نظریہ تخلیق، نجات، کے چھ اصول، خدا پرستی اور دینداری، عبادتی رسم و رواج اور ہندو اخلاقیات کا مکمل و مفصل بیان ہے، آخر میں غیر ہندستانی مذاہب بالخصوص عیسائیت اور اسلام کا ذکر ہے۔ مذاہب کے بارے میں لکھتے ہوئے مصنف نے اس مذہب کے اکابرین کے اقوال، مناجاتوں اور دعاؤں سے اپنی بات کو معتبر بنانے کی کوشش کی ہے۔ باب ہشتم میں موسیقی، مصوری اور رقص کے علاوہ، قدیم تعمیرات، غاروں کے مندروں، مٹی اور دھات سے بنی ہوئی چیزوں کا ذکر ہے۔ باب نہم میں جو زبانوں سے متعلق ہے، دراوڑی زبانوں اور ان کے ادب کے علاوہ سنسکرت کے عشقیہ ویدک ادب، رزمیہ ادب، عشقیہ شاعری اور بیانیہ شاعری، ڈرامہ نویسی، پھر پالی ادب، پراکرت ادب، اور لوک گیت کا اجمالاً بیان ہے اور منتخب ادبی شہ پاروں کو نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے، باب دہم میں جو اس کتاب کا آخری باب ہے اور جو مصنف نے اختتامیہ کے طور پر لکھا ہے دو چیزوں کا خصوصی ذکر ہے۔ ایک تو ہندوستان پر مغرب کے کیا کیا اثرات مرتب ہوئے اور ہندوستان نے کس طرح ان اثرات کو قبول کیا، دوسرے یہ کہ ہندوستان نے تمدنِ عالم کو کتنا متاثر کیا اور دنیا کو اپنے تہذیب و تمدن کے ذریعے کیا دیا۔

کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں اس دور کے علم کائنات جغرافیہ، علم ہیئت، تقویم الاوقات، ریاضی، طبیعات اور کیمیا، عضویات، طب، منطق اوزان اور پیمانے، سکہ سازی، حروف تہجی اور ان کا تلفظ، عروض اور خانہ بدوش قبائل سے متعارف کرایا گیا ہے جو کتاب کی افادیت میں اضافے

کا سبب ہے۔ ایک اور بات جو اس کتاب کی افادیت کو دوبالا کرتی ہے وہ اس میں موجود تصاویر اور نقشہ جات ہیں جو اس دور کو سمجھنے میں کافی معاون ہوتے ہیں مصنف نے ہندستانی زندگی اور ہندستانی فکر کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ کوشش غیر جانبداری اور ایمانداری کے ساتھ کی گئی ہے جو ایک مورخ اور تاریخ کے طالب علم کے لیے شرطِ اوّلیں ہے۔

کتاب اصلاً انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی جس کا ترجمہ ایس. غلام سمنانی نے اردو میں اس مہارت کے ساتھ کیا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کتاب ترجمہ کی ہوئی نہ ہو بلکہ اسی زبان میں لکھی گئی ہو۔

کتاب کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔

•

ذرائع نقل وحمل کی ابتدا / ایل. اے. ہیٹسن

مترجم: مہ جبیں اختر

صفحات: 59، قیمت: -/22 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: ریاض الدین

آج کا انسان لاکھوں سال کی محنت اور تگ ودو کے بعد ترقی کی معراج پر پہنچ پایا ہے۔ آج ہم سائنس کے جس دور میں جی رہے ہیں اس تک پہنچنے میں انسان اس طویل مسافت کے دوران مختلف مراحل سے گزرا ہوگا اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے بہت ساری قدرتی آفات سے نبرد آزما ہوا ہوگا۔ موجودہ ترقی یافتہ انسانی زندگی انھی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب "ذرائع نقل وحمل کی ابتدا" میں ایل. اے. ہیٹسن نے انسانی ذرائع نقل وحمل کے ابتدائی دور سے لے کر نقل وحمل کی دنیا میں آنے والے انقلاب تک کا عہد بہ عہد جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ حکومتِ ہند کی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل نے پورے ملک کے بچوں کو ان کی مادری زبان کے ذریعے تعلیم دینے کا جو جامع طریق کار وضع کیا ہے اور اس پر عمل پیرا بھی ہے، اسی منصوبے کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو طلبہ کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اردو زبان میں ابتدائی، ثانوی، اور اعلا ثانوی درجوں کے لیے کتابیں شائع کر رہی ہے، مذکورہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب چھوٹے چھوٹے کل سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ شروع میں انسان کے پاس نقل وحمل کے لیے ننگے پاؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ زندگی نہایت ہی غیر یقینی اور پر خطر تھی۔ دھیرے دھیرے انسان نے جانوروں کے ذریعے نقل وحمل کو کچھ آسان بنایا۔ پھر پہیے کی ایجاد کی اور پہیہ دار گاڑیاں بنائیں۔ پہیے کی ایجاد انسانی نقل وحمل کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ذریعے انسانی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئیں اور زمینی نقل وحمل بہت آسان ہو گیا۔ پہیے کی مدد سے انسان نے رتھ بنائے اور تجارت کو فروغ دیا۔ رتھ سے ریل اور ریل سے ہوائی جہاز تک کا سفر بڑا ہی دلچسپ ہے جس کو ہیٹسن نے بچوں کے ذہنی معیار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے اور انھی کی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب میں تصویریں بھی دی گئی ہیں تاکہ بچے بہتر طور سے سمجھ سکیں اور ان کے ذہن میں یہ بھی واضح رہے کہ کس عہد میں نقل وحمل کے کیا کیا ذرائع تھے اور عہد بہ عہد کیا کیا ترقیاں ہوئیں۔ مثلاً ما قبل تاریخ کے ہندستان میں نقل وحمل کے کیا کیا ذرائع تھے۔ ہڑپا اور ویدک کے زمانے میں کیا ترقی ہوئی۔ کانسے کے زمانے میں کیا ہوا۔ لوہے کی دریافت نے کیا انقلاب برپا کیا۔ موریہ اور گپت کے زمانے میں نقل وحمل کے کن کن ذرائع کا استعمال کیا جاتا تھا۔ 'تیرھویں صدی عیسوی میں دنیا کا سفر' میں بتایا گیا ہے کہ انسان نے کس طرح مختلف ممالک کے سفر کو آسان بنایا۔ 'ریل گاڑی سے پہلے کا زمانہ' اور 'ریل گاڑیوں کا زمانہ' غرض تمام مدارج کا ذکر مع تصاویر آسان لفظوں میں کیا گیا ہے جس میں بری، بحری اور ہوائی نقل و حمل تینوں کا ذکر ہے۔

امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے لیے کارآمد ثابت ہوگی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے یہ کتاب اردو میں شائع کر کے اردو طلبہ کی ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔

•

انہار / رفیق راز

صفحات: 201، قیمت: -/330 روپے

ناشر: استعارہ پبلیکیشنز، 53۔اے، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی

مبصر: شمس الرحمٰن فاروقی

رفیق راز کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں پہلو اس کا فکری آہنگ ہے۔ غزل کے بارے میں مدت تک یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں رہی کہ اسے سادہ اور میٹھا اسلوب ہی درکار ہے۔ بعض لوگوں نے تو غزل میں استعارے کو بھی ناپسند کیا ہے۔ بعض لوگوں نے غزل سے تقاضا کیا کہ اس میں صرف آپ بیتی اور ذاتی داخلی وارداتوں پر مبنی مضامین ہوں۔ رفیق راز ان شعرا میں نمایاں ہیں جنھوں نے غزل کے اس روایتی پیکر کو توڑنے اور غزل کی آواز میں توانائی ڈالنے کی

کامیاب کوششیں کی ہیں۔ رفیق راز کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے لہجے اور افکار دونوں میں تمکین اور پختگی کے آثار نمایاں ہیں۔ گرد و پیش کی زندگی اور شاعر کے احساس اور ذات کا اس سے محاربہ رفیق راز کی غزل کا خاص موضوع ہے۔ لیکن وہ گرد و پیش کی زندگی کو سیاہ چادر کی طرح اپنے اوپر اوڑھتے نہیں، اور نہ وہ اپنے محاربے کو جھنڈے کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ انھیں اپنے محسوسات اور مشاہدات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں کوئی مشکل اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ شعر کے تقاضوں کو باقی تمام چیزوں پر مقدم جانتے ہیں۔ ان کے شعر کا آہنگ انفعالیت اور بے چارگی کے احساس سے بالکل عاری ہے۔ زبان کے ساتھ بھی ان کا رویہ غیر رسمی اور تخلیقی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ رفیق راز کا یہ پہلا مجموعہ اربابِ نظر میں مقبولیت حاصل کرے گا اور مزید کئی مجموعوں کی پیش آمد ثابت ہوگا۔

•

اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ/محمد اشرف

صفحات:-300، قیمت:-/150 روپے

ناشر: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ

مبصر: تابش مہدی

اردو ناول اور افسانے کے حوالے سے عصمت چغتائی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کی شہرت میں دو عوامل کارفرما ہے۔ اوّل ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور دوم عریاں نگاری۔ عصمت چغتائی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں، جنھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے ہم جنسی کے میلان کو موضوع بنایا۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ'' محمد اشرف کا وہ مقالہ ہے، جو انھوں نے اختر بستوی کی نگرانی میں تحریر کیا تھا اور گورکھ پور یونیورسٹی نے اس پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری تفویض کی تھی۔ یہ کتاب پروفیسر محمود الٰہی کے مقدمے کے علاوہ کل تین ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب عصمت چغتائی کی سوانح سے متعلق ہے۔ دوسرے باب میں عصمت چغتائی کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ عصمت کے ناولوں کے تفصیلی مطالعے کے بعد محمد اشرف اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ ایک عورت کی حیثیت سے عصمت نے جس انداز سے عورتوں کے مصائب و مسائل کا ذکر اپنے ناولوں میں کیا ہے، وہ صرف انھی کا حصہ ہے۔ مقالہ نگار کے خیال میں عصمت چغتائی خواتین میں کوٹ کوٹ کر وہ جذبہ بھر دینا چاہتی تھیں، جس سے انھیں اپنا مستقبل سنوارنے میں کسی کی محتاجی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

کتاب کے تیسرے باب میں عصمت کی افسانہ نگاری پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس ذیل میں اُن تمام موضوعات کا تجزیہ کیا گیا ہے، جو عصمت کے ہاں خصوصیت سے برتے گئے ہیں۔ محمد اشرف نے عصمت چغتائی کی جنسیت اور عریاں نگاری کو بھی اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے اور ان کے متعدد افسانوں کا تجزیہ کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عصمت چغتائی نے اردو فکشن خصوصاً افسانے کی صنف کو بے باکی و جرأت عطا کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عصمت نے اگرچہ جنسی مسائل پر ہر طرح کی بحث کی ہے اور اپنے افسانوں میں جنسیت کو بہت واضح طور پر برتا ہے تاہم اُن پر عریاں نگاری کا الزام نہیں عائد کیا جاسکتا۔ تبصرہ نگار کی رائے میں ان کا یہ خیال واقعیت کے خلاف ہے۔ عصمت نے اکثر مواقع پر اخلاقی قدروں کا جس انداز سے مذاق اڑایا ہے اور جس طرزِ زندگی کی وکالت کی ہے، اس سے ان کے ذہنی جھکاؤ کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

□□□

ہندستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی آر گیڈگل، پروفیسر ایم صدیقی

ہندستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت -/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت -/149 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

محمد خلیل بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "حیوانات کی دلچسپ کی دنیا" سے ایک مضمون پیش کیا جارہا ہے۔

حیوانات ہماری رنگ برنگی دنیا کی حسن و دلفریبی میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں بھی معاون ہیں۔ اس کتاب میں بڑے دلچسپ انداز میں مختلف قسم کے حیوانات مثلاً ڈائنوسور، ہرن، بلّی، ہائیڈرا، جگنو، شیر اور چیتا وغیرہ سے متعلق تفصیلات درج ہیں۔ ایک بے حد دلچسپ کتاب جس کو بچوں کے ساتھ بڑے بھی پسند کریں گے۔ 111 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف -/17 روپے ہے۔

چمکنے والا جگنو

رات کے وقت تھوڑی دیر پر چمکنے والے کچھ کیڑے جیسے پتنگوں کو آپ نے دیکھا ہوگا، اس کا نام جگنو (فائر فلائی) ہے لیکن یہ بے چینی آپ کو ضرور ہوئی ہوگی کہ آخر یہ چھوٹا سا کیڑا کس طرح چمکتا ہے اور اس کی روشنی کے پیچھے کیا راز چھپا ہوا ہے۔ اُسے چمکتے ہوئے دیکھ کر ہر شخص تعجب میں پڑ جاتا ہے۔ لیکن جگنو کے چمکنے کا منظر سبھی کو اچھا معلوم ہوتا ہے۔ چمکنے کی تاروں جیسی یہ قدرتی خصوصیات جگنو کے علاوہ اور کسی جاندار کیڑے میں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ قدیم زمانے میں لوگ جگنوؤں کو پکڑ کر شیشے کی چمنیوں میں بند کر دیتے تھے اور اُن سے روشنی کا کام لیتے تھے۔

جگنو ساری دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر شمالی امریکہ، برطانیہ، برازیل اور کیوبا میں یہ خوب دکھائی دیتے ہیں۔ ہندستان میں بھی یہ برسات کے دنوں میں جھنڈ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی مختلف قسمیں ہیں جن میں چمکنے کے رنگ میں بھی فرق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی جگنو کم چمکتا ہے تو کوئی زیادہ۔ مثال کے طور پر ہرے رنگ کے جگنو پیلی روشنی پیدا کرتے ہیں تو پیلے رنگ کے جگنو ہرے رنگ کی روشنی۔ سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق جگنو کی تقریباً دو ہزار قسمیں ساری دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ جب کہ جگنو کے جسم کی لمبائی تقریباً ایک سے ڈیڑھ سینٹی میٹر سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ایسے جگنو بھی ہیں جن کی لمبائی آٹھ سے نو سینٹی میٹر تک ہوتی ہے جو عام طور پر امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس جگنو کے جسم سے ایک ساتھ سُرخ روشنی سَر سے اور ہری روشنی دُم سے نکلتی ہے۔ اسی طرح پانچ سینٹی میٹر لمبائی کے جگنو برازیل میں پائے جاتے ہیں۔

جگنو چھ ٹانگوں والا ایک چھوٹا جاندار ہے۔ اس کی آنکھ بڑی، پاؤں لمبے اور پَر چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ عام طور پر نمی والے مقامات پر رات میں دکھائی دیتا ہے اور دن میں کھیتوں اور جھاڑیوں میں جا چھپتا ہے۔ دریا کا کنارہ جگنو کے رہنے کی پسندیدہ جگہ ہے۔ جگنو کی غذا چھوٹے کیڑے مکوڑے، گھونگھے، کیچوے اور مکھیاں ہیں۔ یہ گوشت کھانے کا بڑا شوقین ہے۔ یہ ایک ماہر شکاری کی طرح اپنا شکار داؤں پیچ سے عجیب انداز میں پھنسا لیتا ہے۔ قدرت نے اِسے عجیب و غریب صلاحیت سے نوازا ہے۔ اب جگنو کے اس تعجب خیز عمل کے بارے میں بھی سُن لیجیے۔ جگنو اپنے چمٹے جیسے عضو سے دھیرے دھیرے شکار کو گدگداتا ہے اور اُسی دوران اُس کے جسم میں ایک قسم کا رقیق زہر اندر داخل کر دیتا ہے۔ اس سے اُس کا

شکار بے ہوش سا ہو جاتا ہے۔ اسی وقت شکار کا جسم گلنا شروع ہو جاتا ہے اور جگنو اسے بہت شوق سے پیتا ہے۔ جگنو کا سب سے بڑا دشمن مینڈک ہے اس کا دور زندگی تتلی سے ملتا جلتا ہے۔ مادہ جگنو انڈہ دینے میں بڑی لاپرواہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُڑتے وقت گھاس یا درخت کہیں بھی انڈے دے کر اُڑ جاتی ہے اور ان انڈوں سے بعد میں بچہ نکل آتا ہے۔ اندھیرے میں جگنو کے انڈے بھی چمکتے ہیں۔

جگنو کی سب سے بڑی تعجب خیز خصوصیت اُس کا رُک رُک کر چمکنا ہے۔ پیدائش کے بعد جگنو کے جسم پر نچلے حصّے میں سفید نقطے ہوتے ہیں جسے ہم روشنی والے عضو کے نام سے جانتے ہیں جب کہ بڑے جگنو میں پیٹ کے آخری حصّے میں تین چار خانوں میں روشنی کے عضو موجود ہوتے ہیں۔ اس طرح جگنو کا پورا جسم نہیں چمکتا بلکہ جسم کا پچھلا حصہ ہی روشنی دیتا ہے۔ یہ عضو جسم میں جالی نما پھیلی نلیوں سے جا ملتے ہیں۔ جب بھی جگنو اپنی روشنی کو چمکانا چاہتا ہے تو وہ اپنے جسم کی ہوا کی نلیوں سے ہوا لینے اور نکالنے کا عمل شروع کر دیتا ہے جس سے روشنی کے عضو جلنے اور بجھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سچ پوچھیے تو جگنو کا چمکنا ایک کیمیائی طریقہ ہے جو جگنو کے سانس لینے سے جڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جگنو اندر کی طرف سانس کھینچتا ہے تو روشنی والے عضو چمکنے لگتے ہیں۔ لیکن جب جگنو سانس کو باہر نکالتا ہے تو چمکنے والے عضو بجھ جاتے ہیں۔ اس کے ذمّے دار دو کیمیائی مادّے "لوسی فرین" اور "لوسی فیریز" ہیں جو لوسی فر لفظ سے بنتے ہیں جس کے معنی ہیں "روشنی والا" اس کی دریافت فرانس کے سائنس داں رافیل ڈبودا نے کی تھی، اس کے بعد ایک دوسرے سائنس داں ڈاکٹر ایچ. ایچ سولیگر نے کافی محنت کے بعد یہ پتہ لگایا کہ "لوسی فرین" ایک قسم کا پروٹین ہے اور دوسرا مادّہ لوسی فیریز ایک قسم کا انزائمی عمل والا مادّہ ہے جو ہوا کی آکسیجن کے قریب آنے پر چمک اُٹھتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب جگنو سانس لیتا ہے تو سانس کی نلی کے ذریعے ہوا اُس کیمیائی مادّے کو چھوتی ہے۔ جسے ہم لوسی فیرین کے نام سے جانتے ہیں۔ ہوا میں آکسیجن سے ملتے ہی وہ مادّے چمک اُٹھتے ہیں اس میں جگنو کا سانس لینا اور سانس کو باہر نکالنا دونوں جاری رہتا ہے اور اس طرح جگنو کا جسم چمکتا اور بجھتا رہتا ہے۔ عام طور پر جگنو پانچ سے آٹھ سیکنڈ کے وقفے سے چمکتا اور بجھتا ہے۔ لیکن نر جگنو اُسی وقت چمکتا ہے جب وہ اُڑتے وقت اُوپر کی طرف اُٹھ رہا ہوتا ہے۔ گرتے وقت نر جگنو مادہ جگنو کے مقابلے میں زیادہ تیز چمکتے ہیں۔ جب کہ مادہ جگنو دو سیکنڈ کے وقفے پر چمکتے ہیں۔ ہر جگنو میں ان کا چمکنا اور بجھنا تیز یا ہلکا ہونا بھی کچھ جگنو کی خواہش پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر جگنو جس قدر لمبی سانس لے گا۔ چمک اُسی قدر تیز ہوگی۔ کیونکہ آکسیجن کی مقدار اُتنی ہی زیادہ ملتی ہے۔ لیکن سانس چھوٹی ہوگی تو چمک کم ہوگی۔ کیونکہ آکسیجن کی مقدار کم ملے گی۔ اس کی دریافت 1918 میں سائنس داں ای. این ہاروے نے کی۔

جگنو دشمنوں سے اپنے کو بچانے کے لیے کچھ سیکنڈ تک سانس روک سکتا ہے اور درختوں کی پتیوں میں چھپ جاتا ہے۔ اس وقت جگنو کا چمکنا یا بجھنا بند ہو جاتا ہے۔ اس طرح جگنو اپنے دشمنوں کو بڑی خوبی سے چکمادے کر بچ نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دشمن کی پکڑ میں آسانی سے نہیں آتا۔

جگنو کی روشنی ٹھنڈی کیوں ہے؟

شاید آپ نے غور نہ کیا ہو کہ جگنو کی چمکنے والی روشنی میں کسی طرح کی گرمی نہیں ہے اور یہ سائنس دانوں کے لیے اَب بھی راز بنا ہوا ہے۔ جسے اب تک وہ سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اب تک بھی روشنیوں میں گرمی ضرور موجود ہوتی ہے۔ لیکن جگنو میں "لوسی فیراسی" کے جلنے کے بعد بھی ہمیں کوئی راکھ نہیں ملتی۔ اگر اس راز کو معلوم کرنے میں سائنس داں کامیاب ہو گئے تو یہ روشنی کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ ہوگی۔ کیونکہ اس روشنی سے جلنے والی گیسوں کے جلنے کا خطرہ باقی نہ رہے گا۔ جگنو کسانوں کا گہرا دوست ہے۔ کیونکہ یہ بہت سے کیڑے مکوڑوں کو کھا جاتا ہے جو پودوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

□□□

محمد اسحاق

صدر جمہوریہ کے خواب اور ہندستانی بچے

ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام ملک کے پہلے صدر جمہوریہ ہیں جو صدارتی محل سے نکل کر پرائمری اسکول کے بچوں اور کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ میں گھل مل جاتے ہیں۔ دو سال سے کچھ زائد عرصے میں صدر جمہوریہ ہند نے ملک کے اسکولوں اور کالجوں کے تقریباً ڈھائی لاکھ سے زیادہ بچوں اور طلبہ سے ملاقات کی اور انھیں مخاطب کیا۔ انھیں اپنے آٹوگراف دیے۔ انھیں زندگی میں اونچے خواب دیکھنے کا عزم اور حوصلہ دیا۔ جہاں کہیں وہ جاتے ہیں پرائمری، سیکنڈری اسکولوں اور کالج کے طلبہ سے بات کرنے کا پروگرام اپنے دوروں میں شامل رکھتے ہیں۔ وہ اپنی انگریزی نظمیں بھی سناتے ہیں۔ 19 رجنوری 2004 کو وہ حیدرآباد آئے تو ودیا نکیتن سیکنڈری اسکول، لال دروازہ، پرانے شہر کے ایک غیر معروف اسکول جانے کا پروگرام بھی تھا۔ یہاں وہ چھوٹے بچوں میں گھل مل گئے، عام طور پر بچوں سے ان کا یہ سوال رہتا ہے کہ What is your Ambition in life? (تم بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہو۔) وہ بچوں کے سرخ گالوں، دمکتے چہروں اور چمکدار آنکھوں میں ہندستان کے روشن مستقبل کو دیکھتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں۔ You must dream اس طرح نوخیز نسل کا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ بچوں کو سوالات کرنے کے لیے اکساتے ہیں۔ ایک پانچویں جماعت کی لڑکی نے پوچھا" کیا آپ اپنے بال انگلستان جا کر کٹواتے ہیں؟

ہندستان کی ترقی کا راز آج کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔ نوبل انعام یافتہ امرتیہ سین نے اپنے مضامین اور تقاریر میں غربت، خاندانی منصوبہ بندی، تعلیم اور صحت پر بہت زور دیا ہے تاکہ ملک کی معیشت میں انقلاب آسکے۔ صدر جمہوریہ عبدالکلام دوسری بڑی شخصیت ہیں جنھوں نے اس بنیادی راز پر اپنی ساری توجہ مرکوز کردی ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ ان دنوں بعض لیڈروں کی تقاریر میں بنیادی لازمی تعلیم پر بھی چند باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ اس طرح تعلیم پر قوم کی توجہ کو مرکوز کروانے کا اعزاز عبدالکلام اور امرتیہ سین کے سر بندھتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالکلام کی مشہور کتاب (A VISION FOR THE NEW MILLENIUM), "INDIA 2020"، 1998 میں شائع ہوئی۔ انھوں نے اس کتاب میں بہت سے اعداد و شمار اور ملک کی قدرتی، زرعی اور انسانی دولت کے خزانوں کے ذکر سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندستان 2020 تک دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں آجائے گا بلکہ ایک سپر پاور بن جائے گا وہ لکھتے ہیں۔

A developed india by 2020, or even earlier is not a dream. It need not even be a mere vision in the minds of many indians. It is a mission we can all take up-and succeed.

(2020 تک یا اس سے پہلے ہی ہندستان ایک ترقی یافتہ ملک بن جائے گا۔ یہ محض خواب نہیں ہے۔ اسے بہت سارے ہندستانیوں کے ذہن کا ایک تصوراتی محل نہ سمجھ لینا۔ یہ ایک مشن ہے جس کو ہم سب اپنا سکتے ہیں اور کامیاب ہوسکتے ہیں۔)

اس کتاب کو ایک دس سالہ لڑکی کے نام معنون کیا گیا ہے۔ جو بچوں کے سامنے ان کی تقریر کے بعد آٹوگراف لینے کے لیے نزدیک آئی۔ عبدالکلام نے پوچھا: "What is your Ambition?"

لڑکی نے جواب دیا: "Want to live in a developed india" She replied without hesitation. The book is dedicated to her and the millions of indians who share her aspiration."

(میں ایک ترقی یافتہ ہندستان میں جینا چاہتی ہوں۔ یہ کتاب اس لڑکی کے نام معنون کی جاتی ہے اور ان کروڑوں ہندستانیوں کے نام جو اس لڑکی کے جذبات میں شریک ہیں۔)

بچوں کے لیے دس نکاتی حلف نامہ:

55ویں یوم جمہوریہ کے لیے صدر جمہوریہ کا پیام ریکارڈ کرنے کے سلسلے میں، راشٹرپتی بھون میں 25رجنوری 2004 کو ایک سو سے زائد بچے جمع ہوئے۔ اس موقعے پر صدر جمہوریہ نے ان بچوں کو ایک دس نکاتی حلف نامہ دیا جو درج ذیل ہے:

(1) میں اپنی تعلیم میں پوری تن دہی سے دلچسپی لوں گا اور اس میں اعلا ترین معیار پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

(2) میں آج سے دس ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھاؤں گا۔

(3) میں دس پودے لگاؤں گا اور روزانہ ان کی دیکھ بھال کروں گا تاکہ وہ پھلیں پھولیں۔

(4) میں دیہی اور شہری بستیوں میں جا کر کوشش کروں گا کہ کم از کم پانچ ایسے اشخاص جو نشے اور جوئے کے عادی ہیں انھیں ان بری عادات سے چھٹکارا دلاؤں۔
(5) میں اپنے ہم وطن ساتھیوں کے دکھ درد کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔
(6) میں مذہب، ذات پات اور زبان کے بھید بھاؤ کی تائید نہیں کروں گا۔
(7) میں سچائی پر قائم رہتے ہوئے رشوت اور بے ایمانی سے آزاد سماج کے قیام کی کوشش کروں گا۔
(8) میں ایک باخبر شہری کی طرح اپنے خاندان کو پاک و صاف زندگی گزارنے پر آمادہ کروں گا۔
(9) ذہنی اور جسمانی معذور لوگوں کی دلجوئی کروں گا۔
(10) میں اپنے ملک اور اپنے لوگوں کی غیر معمولی کامیابیوں پر فخر کروں گا۔

بچوں کے لیے یہ دس نکاتی حلف نامہ ان کی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہوسکتا ہے۔ نصاب تعلیم میں اعلا اقدار کی تعلیم کسی درجے میں باقی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ دس اصول بچوں کی زبان سے اُتر کر دل و دماغ کا حصہ بن جائیں اور اپنی عملی زندگی میں وہ ان میں سے چند ایک اصولوں پر ہی کاربند ہوجائیں تو سماج میں نہ صرف سدھار آسکتا ہے بلکہ خود ان کی زندگی روشن راہوں پر چل پڑے گی۔ یہ حلف نامہ کسی ماہر تعلیم کا تیار کردہ نہیں ہے بلکہ ملک کے صدر اور ایک عظیم سائنسداں، بھارت رتن عبدالکلام نے راشٹرپتی بھون میں یہ حلف بچوں کو دلوایا ہے۔ ان بچوں کی زندگی میں یہ لمحے تاریخی ہوں گے۔ اچھا ہوگا کہ یہ دس نکاتی حلف نامہ ہر سال یوم جمہوریہ کے موقعے پر ملک کے تمام بچوں کو دلوایا جائے تاکہ ان کی زندگی میں یہ اعلا اقدار رچ بس جائیں۔

وہ جہاں جاتے ہیں بچوں سے پوچھتے ہیں تمھارا خواب کیا ہے؟ کاش کبھی کوئی بچہ پوچھ لیتا کہ کیا کبھی آپ نے صدر جمہوریۂ ہند بننے کا خواب دیکھا تھا؟ عبدالکلام نے شاید ایسا خواب کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اگر آپ اپنی دلچسپی کے میدان میں مسلسل جدوجہد کرتے رہیں تو ایک نہ ایک دن ایسے اعزازات سے آپ بھی نوازے جائیں گے جو آپ کو بھی آپ کے گمان میں بھی نہ رہے ہوں گے۔

کی نہیں قدرداں کی　　　اکبر کرے تو کوئی کمال پیدا

H.No. 11-4-614/6, Bazarguard,
Hyderabad-500004(A.P.)

□□□

جراثیم

مصنف: بی.ڈی. بہراشین/مترجم: بشریف احمد خاں

جراثیم کرۂ ارض پر پائے جانے والے مختلف النوع جانداروں میں بے حد اہم ہیں۔ یہ مفید بھی ہیں اور مضر بھی۔ زندگی اور موت، صحت اور مرض ہر حالت میں جراثیم ہماری زندگی کا اہم جزو ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں جراثیم سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

صفحات: 129، قیمت -/36 روپے

[illegible]

مصنف: دشتوحر/مترجم: انوار رضوی

چٹانیں ہماری کائنات کا اہم حصہ ہیں۔ اس کتاب میں زمین کی ابتدا اور ارتقا کے مختلف پہلوؤں سے متعلق بعض ایسے حقائق بیان کیے گئے ہیں جن کا انکشاف چٹانوں کے ذریعے ہوا ہے۔ طالب علموں کی آسانی کے لیے متعدد خاکے اور تصاویر بھی شامل کتاب ہیں۔

صفحات: 65، قیمت: -/21 روپے

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی/مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیرِ نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کوبداس/مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

فیکلٹی اسلامک ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام چلائے جانے والے قومی اردو کونسل کے کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر، پورٹ بلیئر، انڈمان کے جلسہ تقسیم اسناد کے موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

گذشتہ دنوں قومی اردو کونسل کی طرف سے مدرسہ مفتاح العلوم، بھیونڈی، مہاراشٹر میں چلائے جانے والے کمپیوٹر سینٹر میں جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔
اس موقعے پر لی گئی تصویر میں جناب ایف. ٹی. خوراکی والا، چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور ایک طالبہ سرٹیفکیٹ کے ساتھ۔

URDU DUNIYA Monthly, July 2004, Vol. 6, Issue: 7
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

بوسکی کا پنچ تنتر (پانچ حصوں میں)

مصنف: گلزار

صفحات: 120، قیمت مکمل سیٹ: /150 روپے

بوسکی کے کپتان چاچا

مصنف: گلزار

صفحات: 68، قیمت: [illegible] روپے

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

صفحات: 307، قیمت: /96 روپے

خواجہ میر درد

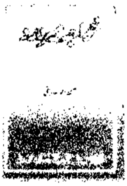

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

صفحات: 164، قیمت: 14 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اول)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

صفحات: 352، قیمت: /86 روپے

[illegible]

مصنف: کاوش بدری

صفحات: 176، قیمت: /98 روپے

دل کی گیتا

مدون: مخمور سعیدی

صفحات: 240، قیمت: /92 روپے

یونانی ادویہ مفردہ

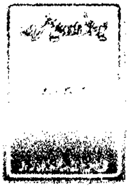

مصنف: حکیم سید صفی الدین علی

صفحات: 365، قیمت: /70 روپے

نوٹ: طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers, Jama Masjid, Delhi-110006 and Published at NCPUL, West Block-I, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor Dr. M. Hamidullah Bhat. Tel: 26103381, 26103938